

# دیوارِ گریہ کے آس پاس



کاشف مصطفیٰ

سرجن کاشف مصطفیٰ کا تعلق بنیادی طور پر راولپنڈی سے ہے۔ وہ قلب اور پھیپھڑوں کی سرجری کے ماہر ہیں۔ انگلستان سے اعلیٰ تعلیم کے بعد وہ اپنے گروڈاکٹر حسنا احمد کے مشورے پر جنوبی افریقا چلے گئے وہیں ملازمت اور سکونت اختیار کر کے ایسا نام کمایا کہ جنوبی افریقا کے مشہور لیڈر نیلسن منڈیلا کے بھی معالج رہے۔ سیر و سیاحت کے بے حد شوقین ہیں۔ دنیا کو کھلی نظر سے آدھے راستے میں آن کر کشادہ دلی سے گلے لگاتے ہیں

## پارٹ: 1

جب بطور Cardiothoracic Surgeon دوسروں کا دل ٹھیک کرتے کرتے اپنا دل بے قرار ہونے لگتا ہے تو سفر پر نکل پڑتا ہوں۔ ایسی ہی ایک کیفیت کا شکار ہو کر میں نے اعلان کیا کہ میرا گلا پڑاؤ اسرائیل میں ہو گا تو احباب کو اچھا نہ لگا۔ سب ہی جانتے تھے کہ وہ ایک ایسی سرزمین ہے جس کا جغرافیہ مختصر، تاریخ طویل اور فساد لامتناہی ہے۔ کسی نے اسے سونے کے ایک ایسے پیالے سے بھی تشبیہ دی تھی جس میں بچھو کلبلا رہے ہوں۔ میں خود بھی سوچ رہا تھا کہ کیا مملکت ہے، ڈیڑھ ہزار سال ہونے کو آئے اس کا ماضی خون میں لتھڑا ہوا، احال تصادم میں الجھا ہوا اور جس کا مستقبل غیر یقینی ہے۔ غالب نے کہا تھا کہ ع رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور۔۔

میرا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا گو دل میں یہ خواہش یہ تھی کہ ایک رات مسجد الاقصیٰ میں عین اس مقام رفعت پر سجدہ ریز ہوں گا جہاں سے ہمارے نبی کریم ﷺ معراج پر تشریف لے گئے تھے۔ میں نے ملا متی عبادہ اوڑھا اور سب کو کہا کہ اب دل کا انڈیا ناجوز (ہالی ووڈ کی فلموں کا مشہور کردار) نہ مانے تو کیا کروں، یارو مجھے معاف کرو!

یروشلم کا قدیم شہر جس کے چار طرف پرانے پتھروں کی ایک دیوار نے گھیرا ڈال رکھا ہے۔ دنیا کے تین بڑے مذاہب کی جولان گاہ رہا ہے۔ ایک کو یعنی یہودیت کو وہاں پناہ ملی دوسرے کو یعنی عیسائیت کو جنم اور اسلام وہاں فاتح بن کر آیا اور جس کے پیروکار مفتوح بن کر رہتے ہیں۔ بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ عقائد کا یہ ایک دوسرے سے الجھتا سنگم کیسا ہے کہ جس کی انسانی شعور پر حکمرانی ایسی ہے کہ سائنسدان، فلسفی اور ملحد بے پناہ مخالفت و تنقید کے باوجود اس کے پھیلاؤ کو روکنے میں ناکام رہے ہیں۔ اللہ نے اس نیم بنجر سرزمین پر کیا ایسا کرم کیا ہے کہ انبیاء کی ایک کثیر تعداد نے ہیبرون سے یروشلم کی اس تنگ سی پٹی کو مقام سکونت، دعوت اور رفعت بنایا۔ سوال کئی تھے اور جواب ایک ہی، لہذا سوچا کہ خود چل کر دیکھتے ہیں۔

کئی ماہ کی منصوبہ بندی، مطالعے اور تحقیق سے فرصت ملی تو اپریل کی ایک خوش گوار صبح خود کو ایئر بس میں براجمان پایا جو تل ایب کی جانب رواں دواں تھی۔ امریکن کافی کے گھونٹ سے شعور جاگا تو احساس ہوا کہ مسافروں کی ایسی کڑی جانچ پڑتال کہیں اور نہیں ہوتی۔ ہر وہ مسافر جو اسرائیلی باشندہ نہ تھا، چبھتی ہوئی نظروں، کھنگالتے ہوئے سوالات اور احتیاط سے ٹٹلتے ہوئے ہاتھوں سے گزر کر ہی جہاز

میں اپنی نشست تک پہنچ پایا تھا۔ جہاز میں نظر گھمائی تو کوئی بھی ہم سفر ہم نوا نہ تھا۔ ایتھوپیا کے یہودیوں کا ایک چھوٹا سا گروپ تھا۔ انہیں اصلی تے گورے یہودی اپنا ہم پلہ نہیں سمجھتے۔ نائیجیریا کے عیسائیوں کا ایک گروہ بھی اپنے خوش گفتار نوجوان پادری کی رہنمائی میں مقامات مقدسہ کی زیارت کے لیے جا رہا تھا۔ جنوبی افریقا کے کچھ متمول یہودی خاندان بھی نشستوں پر براجمان تھے۔ جہاز کے ائیل میں سیر کے لیے کھڑا ہوا تو اپنے علاوہ کسی اور کو مسلمان نہ پایا۔ البتہ اپنے دوست کی اس بات کی تصدیق کے لیے کہ کیا اسرائیلی ہوائی کمپنی ایل عال (آسمانوں کی جانب) میں ہمہ وقت ایک دو کمانڈو ہوتے ہیں۔ اپنا بدن سامنے رکھ کر ہر مردانہ بدن کا بغور جائزہ لیا۔ مایوسی ہوئی۔ نشست پر آن کر بیٹھا تو دل کے رخسار پر نہ سہی کاندھے پر ایک نرم سا ہاتھ اس دعوت کے ساتھ دکھائی دیا کہ۔

your halaal meal sir

کھانے کا ایک لقمہ یقین دلا گیا کہ بے حد بد ذائقہ کھانا ہے۔ دل نے سوچا کاش اس سفر میں اگر نواز شریف ساتھ ہوتے تو کم از کم کھانا تو اچھا مل جاتا، کالے تیتڑ کا قورمہ، مینی روغن جوش، گشتابہ، دہی بڑے، فنجے کے پاوے، تبک ماز، زعفرانی کھیر، دہلی کے حلوائی کی رس ملائی۔ جب فضائی میزبان نے بددلی مگر خاموشی سے کھانے کی ٹرے ہٹائی تو ایتھوپیا کا یہودی ربی جو ہم نشست تھا گویا ہوا کہ ”کھانے کو برا سمجھنا اچھی بات نہیں“۔ میں نے غور سے دیکھا تو ایسا لگا کہ فاقہ زدہ سرسید پڑوس میں بیٹھے ہم کلام ہوں۔ چہرے پر ایسی ڈاڑھی، لگے کہ منہ پر ڈاڑھی نہیں بلکہ ڈاڑھی پر منہ رکھ دیا گیا ہے۔ سیاہ کوٹ اور سیاہ ہیٹ پہنے ہوئے، گہری جائزہ لیتی ہوئی نگاہوں۔ مصافحے کے لیے تعارف کراتے ہوئے اپنا ہاتھ بڑھایا کہ ”میرا نام شائم آمنون ہے“۔ میری نگاہ اب اس کی آنکھوں کی بجائے بالوں کی اس لٹ پر تھی جو کانوں سے بہہ کر بل کھاتی ہوئی ایک بدنصیب ناگن کی طرح اس کے سینے پر پڑی تھی۔

”اقصی جانے کا ارادہ ہے؟“ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں یہاں کسی بزنس ٹرپ پر آیا ہوں“ مجھے بھی سچ بولنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ اسے جواب سن کر مایوسی ہوئی اور وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

ایکایک مجھے احساس ہوا کہ یہودی عالم عام طور پر غیر مسلموں سے گفتگو میں پہل نہیں کرتے۔ یہ ایک سنہری موقع ہے جو میں بے جا احتیاط کے چکر میں ضائع کر رہا ہوں۔ میری ایک عمران یہودی افراد کے درمیان پیشہ ورانہ خدمات سرانجام دیتے ہوئے گزری تھی۔ میں نے بہت آہستگی سے منقطع سلسلہ پھر سے جوڑ دیا۔ ”وہاں میری دلچسپی کی کیا شے ہو سکتی ہے؟“

”کاروبار کے معاملے میں تو میں آپ کو مشورہ نہیں دے سکتا؟“ مجھے لگا کہ اس نے میرا جھوٹ پکڑ لیا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک روحانی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسرائیل ایک مقدس سرزمین ہے، آپ کا عقیدہ کچھ بھی ہو، آپ یہاں سے خالی ہاتھ نہیں لوٹتے۔“

”اس کا ادراک مجھے ایئرپورٹ پر ان کے رویے سے ہو گیا تھا۔ ہر طرف خفیہ کارندے۔“ میں نے بھی ایک محدود پیمانے کی جنگ چھیڑ دی۔

”آپ کا شکوہ صیہونیت سے ہے، اسرائیل سے نہیں۔ اگر ایک طاقتور گروپ مذہب اور کاسٹم کا اجارہ دار بن جائے تو معاشرہ کمزور اور زوال پذیر ہو جاتا ہے اور اس کاسٹم کی بربادی شروع ہو جاتی ہے۔ یہودیت اور صیہونیت دو علیحدہ نظام ہیں۔ ہم کبھی بھی Siamese twins (ایک سر دو دھڑ والے جڑواں بچے) نہیں رہے جیسا کہ دنیا کو باور کرایا جاتا ہے۔“ اس کا جواب سن کر مجھے اپنی سماعت پر شک سا ہونے لگا۔

”پھر صیہونیت کیا ہے؟“ میں نے سوچا کہ آج اس کی ہم سفری کالابھ لوں!

صیہون یا Sion کا مطلب سورج کے پجاری ہوتا ہے۔ یہ حضرت یوسف والے علاقے کنعان کا ایک قدیم فرقہ تھا جو ہر حال میں اقتدار پر قابض رہنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی وضاحت میں معذرت سے عاری تھا۔

”ہم غیر یہودی تو دونوں کو ایک سمجھتے ہیں“ میں بھی مصر ہی رہا!

”بہت جلد تم دیکھو گے کہ ہم یہ ناخوشگوار بوجھ اپنے وجود سے اتار پھینکیں گے۔ ساری دنیا کے یہودی بتدریج اس کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔ اس نے اپنا پتلا ہاتھ پھیلا دیا۔ پانچ انگلیاں مختلف سائز، مختلف کام مگر ایک ہاتھ۔ ایک وجود۔ اس کی ہم یہودیوں کے ہاں بڑی اہمیت ہے، اسے ہم خمسہ کہتے ہیں۔“ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا مگر اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ پوچھتا، وہ اٹھ کر اپنے گروپ کو ہدایات دینے چلا گیا۔

مجھے بھی نیند نے آن لیا۔ آنکھ کھلی تو شائتم امنون ساتھ ہی بیٹھا تھا، خاموش اور بہت جدا جدا۔ اسی دوران میں اسپیکر پر اعلان ہوا کہ ہم اسرائیل کی فضائی حدود میں داخل ہو گئے ہیں۔ جہاز میں اس اعلان کے ساتھ دعاؤں کا ایک غلغلہ بلند ہوا، یہودی ربی اٹھے اور جھک جھک کر تعظیم پیش کرنے لگے، مالدار فرہ اندام یہودی خواتین جن کا جنوبی افریقا سے تعلق تھا اور جو اپنی ملازماؤں کے ساتھ اسرائیل جا رہی تھیں، سسکیاں لے لے کر رونے لگیں۔ مجھے مسجد تنیم اور میقات یاد آ گئے۔ اگلے ہی لمحے ہم بن گوریاں ایئرپورٹ پر اتر گئے (بن گوریاں اسرائیل کے پہلے صدر تھے، انہیں صدر فضل الہی چوہدری اور رفیق تارٹ بننے کا موقع اس لیے ملا کہ عظیم یہودی سائنسداں آئن سٹائن نے اس عہدے کو قبول کرنا اپنی علمی مصروفیات کی راہ میں رکاوٹ جانا تھا اور انکاری ہوئے تھے۔





میرے جنوبی افریقا والے پاسپورٹ کے لیے اسرائیل کا ویزہ لازم نہیں مگر مجھے لگا کہ پاک وطن کی وجہ سے تنگ کریں گے۔۔۔ مجھ سے آگے لائن میں کھڑے تین گوروں کا داخلہ وہ سر کی ایک جنبش سے منسوخ نہ کرتی تو خاتون امیگریشن افسر کی حلاوت اور انداز آپ کو کسی فروٹ پنچ کی یاد دلاتا تھا۔ مشرق و مغرب میں ایسا لگتا تھا اس کے نسوانی سراپے کو دوسری نسل نے دل سے قبول کر لیا تھا۔ گوانگریزی پر فرنچ زبان کی گلابی خواب آویز دھند چھائی ہوئی تھی۔

میری باری آنے پر اس کی ابرو نے ایک خوش گوار کمان کا روپ دھارا (یہ بدنی زبان میں اظہار قبولیت کی علامت ہے۔ جو لوگ آپ کو ناپسند کرتے ہیں وہ آنکھیں سکیر لیتے ہیں) سوال کرتے ہوئے ایسے ہی ہم آہنگ کمان اس کے ہونٹوں نے بھی بنائی۔

”جائے پیدائش“؟ ”پاکستان“ میں نے بھی نعرہ تکبیر کی طرح خود اعتمادی کا ثبوت دیتے ہوئے سارے اسرائیل کو بتا دیا۔ بلند لہجے پر وہ مسکرائی۔ منہ میں قلم اور کمپیوٹر پر بٹن دبایا۔ ایک کارڈ نکل کر آیا جس پر میری تصویر، پاسپورٹ نمبر اور قیام کی مدت درج تھیں۔ ایک اداسے مجھے جب وہ کارڈ اس نے پاسپورٹ سمیت لوٹا یا تو کہنے لگی:

Welcome to Israel Sir ”جو مجھے پنجابی میں ”صد بسم اللہ آیائوں“ ہی لگا!

\*\*\*\*\*

بن گوریاں انٹرپورٹ پر پہلا گمان پتھروں کے بنے ایک بڑے سے قدیم تھیٹر کا ہوتا ہے۔ جا بجا حفاظتی اہل کار ایسے ہی ایستادہ دکھائی دیتے ہیں جیسے اسرائیل میں دیگر مقامات پر موجود ہوتے ہیں۔ سامان اور کسٹمز سے گزر کے جب میں باہر آیا تو ڈاکٹر کلوری کے ڈرائیور کی تلاش ایک مرحلہ تھی۔ ڈاکٹر صاحبہ جنوبی افریقہ میں میری شریک کار تھیں۔ اب یہاں تل ایسب میں ماہر امراض قلب کی خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔ میرا خیال تھا کہ مروجہ طریقے کے مطابق کوئی میرا نام کا استقبالی کتبہ تھامے کھڑا ہوگا۔ وہاں ایسے کوئی آثار نہ تھے۔ یہ سوچ کر کہ ڈاکٹر لی کا ڈرائیور شاید ٹریفک میں کہیں پھنس گیا ہے۔ میں باہر رکھی ایک بینچ پر بیٹھ کر اپنے فون سے چھیڑ چھاڑ میں لگ گیا۔

جا فاپر مسلمان آٹھویں صدی سے 1917ء تک یعنی گیارہ سو سال حکمران رہے۔ یہ وہ سال تھا جب یہاں برطانوی راج قائم ہوا اور یہودی یورپ سے پہنچنے لگے۔ جس کی وجہ سے مقامی مسلمان آبادی اور ان میں قومی فسادات بھڑک اٹھے۔ چند ساعتوں کے بعد نظر اٹھی تو سامنے ایک فوجی قد کاٹھ کے پیٹر جاسوس کو ایستادہ پایا۔ چھوٹے بال، سیاہ چشمہ، بہت خاموشی سے جائزہ لیتا ہوا۔ مجھے لگا کہ خیر نہیں۔ لگتا ہے موساد کو میرے آنے کی اطلاع مل گئی ہے۔ اس نے بھرائی آواز میں پوچھا کہ کیا آپ ہی ڈاکٹر مصطفیٰ ہیں تو دھاڑیں بندھی۔

میرا جواب اثبات میں پا کر اس نے بہت آہستگی سے اپنا نام وائن بتایا اور یقین دلایا کہ اسے ڈاکٹر کلوری نے ہی بھیجا ہے۔ میرے مزید رد عمل کا انتظار کیے بغیر اس نے ایک کمال آہستگی سے ڈاکٹر لی کی آرام دہ مرستہ میں مجھے دھکیل دیا جو دھیمے دھیمے سے تل ایسب کے طوفان ٹریفک میں بہنے لگی۔



دار الخلافہ تل ابیب، اسرائیل کا کراچی ہے مگر ویسا بد صورت، بے ہنگم اور بد حال نہیں۔ اس کا شمار خوش حالی میں ابو ظہبی کے بعد پورے مشرق وسطیٰ میں دوسرے نمبر پر ہے۔ شہر کا نام بھی اس کا مطلب جان لینے پر اور بھی حسین لگتا ہے۔ اس کا مطلب پہاڑی (Tel) چشمہ (Aviv) ہے۔ 1948ء میں اسے غریبوں سے بیاہی ہوئی پنڈی کی خوش حال بہن اسلام آباد کی مانند بسایا گیا۔ ان کا پنڈی جافا کو مان لیں گو جافا کی تاریخ زیادہ قدیم اور دل چسپ ہے۔ یورپ کے یہودی ہمارے اپنے مہاجر بھائیوں کی طرح، دہلی اور لکھنؤ جیسی ارض موعود چھوڑ کر سوئے میخانہ سفیران حرم کی طرح اسرائیل کی جانب گامزن تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جو گلیاں چوبارے وہ پیچھے چھوڑ کر آتے ہیں۔ ویسی ہی کوئی بستی یہاں بھی آباد ہو جہاں ہواؤں میں دولت کی مہک ہو۔ جہاں کی فضا خوشگوار اور زندگی تھرکتی مچلتی ہو۔ سب کچھ تو ہو گیا مگر ٹریفک کا نظام کم بخت وہی مسلمانوں والا رہا۔ منزل جنت اور سواریاں اور شاہراہ دوزخ کی ترغیبات سے الجھی ہوئیں۔

ہوائی اڈے سے بحیرہ روم کے ساحل پر واقع ہوٹل تک 20 کلومیٹر کا سفر 70 منٹ میں طے ہوا۔ وائن نے شام سات بجے لینے آنے کا وعدہ کرتے ہوئے ہاتھ ملایا تو لگا میرا ہاتھ کسی لوہے کے شکنجے میں پھنس گیا ہے۔ ڈاکٹر کلور اور ان کے شوہر نے رات کے کھانے پر مجھے مدعو کیا تھا۔ کمرے کی کھڑکی کا شیشہ سر کا یا تو بحیرہ روم کی تازہ ٹھنڈی ہوائ نے چہرہ چھو لیا۔ نیچے جھانکا تو چند اسرائیلی نوجوان فوجی خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اسرائیل میں نوجوانوں کو دو سال کی لازمی فوجی تربیت کے مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہی معاملہ ترکی میں بھی ہے۔ ہمارے اوپر والے جان کر انجان ہیں۔ وہ اسے قومی یکجہتی، صحت مندی اور سرے سے غائب ڈسپلن کے لیے لازم نہیں مانتے ورنہ ساری دنیا میں اسے Standardization کا ایک بہت ہی موثر ذریعہ مانا جاتا ہے۔ اتنے سارے فوجی اس لیے بھی درکار ہیں کہ ہر ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ان کی ملٹری چیک پوسٹ ہوتی ہے۔ کھڑکی سے دکھائی دیتے منظر میں، دور افق پر ایک مینار اس بات کی علامت تھا کہ وہیں مسجد البحر بھی ہے۔

فضائی سفر کرنے والے کہتے ہیں کہ اگر آپ نے سمندر کے اوپر سفر کیا ہے تو جادو ٹوٹکے کا اثر جانتا رہتا ہے۔ گرم شاور، مختصر قیلولہ اور ایک عمدہ کھانا آپ کا حق بنتا ہے۔ میں نے صرف شاور پر اکتفا کیا اور ہوٹل کی استقبالیہ پر آ گیا۔ ڈیسک پر موجود میزبان خاتون کا حسن ایسا تھا کہ اسے دیکھ کر آپ گیت کہتے کبھی سنگیت بنانے چلتے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ”کعبے سے ان بتوں کو نسبت ہے دور کی!“ اس کا حسن دلفریب دیکھ کر دل نہ چاہا کہ مسجد کا راستہ پوچھوں۔ کچھ شرم ہوتی ہے، کچھ حیا ہوتی ہے۔ بھلے سے اتنی قلیل ہی کیوں نہ ہو جتنی فلور آف دی ہاؤس پر یہ شور مچانے والوں میں تھی۔

پاکستانیوں کی طرح میں نے بھی ایک چھوٹی سی چالاکی سے کام لیا۔ ادھر ادھر دیکھ کر لجاوٹ سے پوچھ ہی لیا کہ ”سن نی کڑیئے، رنگاں دیئے پڑیئے۔“ وہ جو ایک بستی ہوٹل کی کھڑکی سے پرے دکھائی دی ہے، ارے وہی جہاں ایک پرانا سا مسافروں کو راستہ دکھانے والا



لائٹ ہاؤس دکھائی دیتا ہے۔ وہ تو شہر کا کوئی قدیم حصہ لگتا ہے۔ وہاں جاسکتے ہیں؟ اسلام آباد ہوتا تو سر کھجاتا اپنی پھوپھی سے تلہ گنگ کے موسم کا سیل فون پر حال دریافت کرتا ہوٹل کا concierge جواب دیتا ”آہو جی اووی اپنا فیض آباد اے۔“

ہمارا سوال سن کر اس کے سرخ لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ کے دو متوازن چراغ روشن ہوئے تو ہم کو نصرت فتح علی خان یاد آئے کہ ع اندھیرے میں دل کے چراغ محبت یہ کس نے جلایا سویرے سویرے۔ اس نے ہم بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھایا اور سوال کے جواب میں بتایا کہ ”یقیناً وہ ہمارا جافا ہے۔“

وہاں آپ پیدل جانا چاہیں تو پندرہ منٹ اور ٹیکسی سے بیس منٹ لگیں گے۔ ”ساحل سمندر کے کنارے چلتے ہوئے مجھے یہ کہیں سے بھی احساس نہ ہوا کہ یہ دنیا کسب سے زیادہ سیاسی طور پر شورش زدہ علاقہ ہے۔ وہی سائیکل سوار بچے، وہی خوش گپیوں میں مصروف خواتین۔ جاگنگ میں مصروف مرد اور عورتیں۔ زندگی ویسے ہی رواں دواں تھی جیسے کوالا لپور یا کیپ ٹاؤن میں ہوتی ہے۔“

اسرائیل کو اس کی حکومت نے تین انتظامی یونٹوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ زون۔ اے میں فلسطینی علاقے جن میں مغربی کنارہ، غزہ وغیرہ شامل ہیں۔ اسرائیلی باشندوں کو ایک سرخ وارنگ بورڈ جسم و جاں کو لاحق خطرات کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ تمام علاقہ ایک باڑ اور دیوار سے احاطہ زنداں میں بدل دیا گیا ہے۔ خروج اور دخول کے مقامات متعین اور سنتریوں کی تحویل میں ہیں۔ اندر سے کوئی باہر نہ جاسکے، باہر سے کوئی اندر نہ آسکے، وہاں کوئی نہیں کہتا کہ سوچو کبھی ایسا ہو تو کیا ہو۔ کیوں کہ اب جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات مانی جاتی ہے۔ زون۔ بی کے انتظامی علاقے میں فلسطینی کام کاج کے لیے آتے ہوئے ہیں مگر قیام نہیں کر سکتے۔ زون سی میں فلسطینیوں کا داخلہ یکسر ممنوع ہے۔ اس زون میں دار الخلافہ تل ابیب بھی شامل ہے مگر یہاں آج بھی دس فیصد آبادی مسلمانوں کی ہے۔ ان کی اکثریت جافا میں رہتی ہے۔ ان جڑواں بستیوں یعنی تل ابیب اور جافا کا انتظام ایک ہی میونسپلٹی کے پاس ہے۔ اس کا نام تل ابیب، یافو ہے۔ یافو عبرانی زبان میں جافا کا نام ہے۔

جافا دنیا کا دوسرا قدیم ترین شہر ہے۔ قدامت کے لحاظ سے پہلا شہر دمشق ہے جو مسلسل آباد ہے۔ وہاں کی روایت کے حساب سے اسے حضرت نوح کے صاحبزادے جافا نے سیلاب تھم جانے کے بعد بسایا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں اسے ساحلی شہر ہونے کی وجہ سے بہت عروج ملا۔ ایک روایت کے مطابق حضرت یونس علیہ السلام کو وہیل مچھلی نے اسی شہر کے کنارے لا کر اپنے پیٹ سے باہر انڈیلا تھا۔ کسی کم بخت مچھلی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ کوئی بھلا مانس اسلام آباد کے زیر و پوائنٹ سے پرے آن کر بھی انڈیل دیتی۔

جس جگہ حضرت یونس مچھلی کے پیٹ سے برآمد ہوئے تھے عین اسی مقام پر مملوک حکمرانوں نے سترہویں صدی میں مسجد البحر بنائی ہے۔ یونانی دیومالائی کہانیوں میں سیفئس (King Capheus) جو جافا کا بادشاہ اسے سمندر کے دیوتا پوزائی ڈن (Poseidon) کو



منانے کے لیے اپنی بیٹی آندرومیدا پیش کرنا پڑی۔ آندرومیدا کو ساحل سمندر پر ایک بڑی سی چٹان کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ پوزائیڈن نے اس کھالینے کے لیے ایک خونخوار عفریت کو بھیجا لیکن ایک یونانی ہیر و پر سی نن نے اس عفریت کو ہلاک کر کے اس کی جان بچائی اور آندرومیدا سے شادی کر لی۔ آندرومیدا کے بارے میں یہ قصے بہت عام ہیں کہ وہ اس قدر حسین تھی کہ اس کی موجودگی میں پھول بھی کھلنے سے ہچکچاتے تھے۔ جافا کی لڑکیاں اپنے حسن کے تانے بانے اسی ”آف شور“ حسینہ سے ملاتی ہیں۔

جافا پر مسلمان آٹھویں صدی سے 1917ء تک یعنی گیارہ سو سال حکمران رہے۔ یہ وہ سال تھا جب یہاں برطانوی راج قائم ہوا اور یہودی یورپ سے پہنچنے لگے۔ جس کی وجہ سے مقامی مسلمان آبادی اور ان میں قومی فسادات بھڑک اٹھے۔ انگریز کے جانب دارانہ رویے سے تنگ آکر مسلمان 1921ء میں ہونے والی خانہ جنگی کے نتیجے میں بائیں کنارے پر اور یہودی جافا اور تل ابیب میں آباد ہونا شروع ہو گئے۔ 1948ء کی جنگ میں یہ سارا علاقہ یہودی تسلط میں آ گیا لیکن کچھ مسلمان خاندان کسی طور یہاں سے جانے پر رضامند نہ ہوئے۔ ان کی اس علاقے میں موجودگی تاریخ کا ایک دل چسپ باب ہے۔ یہاں تین پرانی مساجد، کئی دکانیں اور اور ہوٹل بھی ہیں۔ پتھریلی تنگ پرانی گلیاں آپ کے قدموں تلے آپ کا تعلق نادانستہ طور پر ان قدموں سے جوڑ دیتی ہیں جو انہیں روندتے روندتے خود بھی آسودہ خاک ہو گئے۔

مسجد البحر بالکل خالی تھی۔ میرے جیسے کچھ سیاح ادھر ادھر کہیں فوٹو کھینچ رہے تھے۔ ایک سیاح اندر آنے کا خواہشمند بھی تھا۔ مجھ سے اجازت طلب کی تو میں نے بتایا کہ خاکسار بھی مسافر ہے۔ جس پر اس نے کہا کہ جافا میں غروب آفتاب کا منظر دنیا بھر میں سب سے سہانا منظر مانا جاتا ہے۔ آپ اسے مسجد کے مینار سے دیکھ سکتے ہیں۔ اس کا فوٹو گرانی کا سامان دیکھ کر لگا کہ وہ کوئی پیشہ ور فوٹو گرافر ہے۔ میں بھی سیڑھیوں کے راستے پیچھے پیچھے ہولیا۔ دنیا بھر میں شا میں اداس ہوتی ہیں مگر جافا کی اس شام میں کا حسن کسی حسین بیوہ کی سوگواری کی مانند تھا۔ مینار کی محراب سے میں نے جب سورج کو بحیرہ روم میں ڈوبتے دیکھا تو مجھے لگا کہ خون کی سی سرخی لہروں میں گھل گئی ہے۔ بہت ممکن تھا کہ محو نظارہ ہو کر میں اسی جمال فطرت کی رعنائیوں میں کچھ دیر اور بھی گم رہتا مگر عین اس وقت فون کی گھنٹی بجی دوسری جانب میری دوست ڈاکٹر کلوری چیخ رہی تھی کہ۔ ”کہاں ہو؟ وہ وائٹ تمہارا ہوٹل میں منتظر ہے۔“ میں نے ہڑبڑا کر گھڑی دیکھی تو شام کے ساڑھے سات بج چکے تھے۔ میں منمنایا کہ مسجد البحر کے منارے سے غروب آفتاب کا منظر دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس اعتراف پر فوراً معافی مل گئی کہ وہ بھی اس غروب آفتاب کو دنیا کا سب سے خوبصورت منظر مانتی ہے۔ اس کا اگلا حکم یہ تھا کہ میں وہیں رُکوں۔ ڈرائیور وائٹ مجھے مسجد البحر کے پاس ہی سے لے گا۔ میں نے تمہارے لیے خاص طور پر گولاش (سبزی اور فوشت کا اسٹو، ہنگری کے چرواہوں سے منسوب ہے) اور آرٹھی چوک سلاد تیار کیا ہے۔

”جو حکم مادام میں تیار ہوں“

\*\*\*\*\*

بھوک کا معاملہ بھی عجیب ہوتا ہے۔ آپ جب کھانا شروع کرتے ہیں تب کہیں جا کر احساس ہوتا کہ شکم محرومی کس بلا کا نام ہے۔ جب میں نے دوسری مرتبہ گولاش کو پیالے میں انڈیلا تو اپنے نذیدے پن کا احساس ہوا۔ میں نے اپنی خفت چھپاتے ہوئے اپنے میزبانوں ڈاکٹر کلور اور ان کے میاں ڈیوڈ کی جانب دیکھا۔ ان کے چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ تھی۔ ڈاکٹر صاحبہ ذہین ہیں۔ بے حد ذہین۔ میرے تاثرات پڑھ کر کہنے لگی کسی بھی شیف کے لیے اس سے بہتر تعریف کوئی نہیں ہو سکتی کہ آپ اس کی پکائی ہوئی ڈش خاموشی سے ہڑپ کر جائیں۔ ویسے بھی بھوکے مسافر کو کھانا کھلانا ہمارے ہاں بھی بڑی اعلیٰ درجے کی نیکی سمجھا جاتا ہے۔ مجھے لگا کہ میں نے بھی ایک بھوکے ملاح کی مانند خوب کھایا ہے۔

ڈنر کے برتن ٹیبل سے سمیٹتے ہوئے ڈاکٹر صاحبہ نے مجھے اور ڈیوڈ کو بالکونی کا راستہ دکھایا۔ ان کا پر تعیش اپارٹمنٹ تل ایب کے ایک مہنگے علاقے اور مشہور ترین روتھ شیلڈ بولے ورڈ پر واقع تھا۔ بالکونی سے نیچے پر رونق کلب اور ریسٹوران اور مہنگے بوتیک قطار در قطار موجود تھے۔ ڈیوڈ نے ادھر ادھر دیکھا اور اپنے کوٹ کی جیب سے دو عدد مونٹی کر سٹو سگار برآمد کیے۔ اسے یاد تھا کہ میں جب تعطیلات پر نکلا ہوا ہوں تو یہی سگار شوق سے پیتا ہوں۔

ڈیوڈ کو یہودیوں کا ربی (یہودی مذہبی پیشوا اس کا اردو، انگریزی اور عربی ترجمہ وہی ہوتا ہے یعنی مولیٰ۔ انا میرے آقا، My Lord) بننے کا شوق تھا۔ اس کے ارادے کی تکمیل کی راہ میں سب سے بڑی یہ مجبوری بنی کہ اس کی والدہ یہودی نہ تھیں۔ قربت الہی اور بھٹکے ہوؤں کی رہنمائی کی قابلیت کے جو سرٹیفکیٹ ان کا دارالانائسین (Board of Deputies) جاری کرتا ہے، اس نے والدہ کا یہودی نہ ہونے کا خفیہ عذر سامنے رکھ کر ڈیوڈ کو کئی کئی دفعہ امتحان میں فیل کیا۔ تو اس نے بھی نیا پیشہ اپنانے کی سوچی اور کاروں کی ڈیلر شپ لے کر بیٹھ گیا۔ اب وہ ایک کامیاب کروڑ پتی بزنس مین ہے۔

”تو آپ پھر ربی بننے سے رہ گئے۔؟“ میں نے بھی چھیڑا

”ہرگز نہیں ربی تو میں اب بھی ہوں۔ بس میرے پاس سرٹیفکیٹ نہیں۔“ اس نے چالاکی سے جواب دیا۔

میرے تل ایب سے جلد رخصت ہونے کا سن کر اسے افسوس ہوا۔ اس نے جتلیا بھی کہ میں نے تو ٹھیک سے ابھی تل ایب دیکھا بھی نہیں کچھ دن اور ٹہروں۔

”یہ میرے مزاج کا شہر نہیں۔ بہت جدید ہے۔ اس کی تاریخ بھی صرف 110 سال پرانی ہے اسرائیل کی دیگر بستیوں کے مقابل میں تو یہ محض ایک دودھ پیتا بچہ ہے“ میں نے جان چھڑاتے ہوئے جواب دیا۔

”ہاں میں تو بھول ہی گیا تھا کہ تم خود بھی ایک ایسے اجڑے ہوئے ماہر آثار قدیمہ کی روح ہو جو سرد مہری سے ہیٹ پہنے ویرانوں اور تاریخی نوادرات کو کھوجتا ہو۔ لیکن میرے دوست ایک بات کا خیال رکھنا حالات کچھ گمبھیر ہیں، مسجد اقصیٰ اور ہسبرون جہاں آپ جانا چاہتے ہو، وہاں چند دنوں سے کسی نہ کسی کو چھرا گھونپ دیا جاتا ہے۔ اسرائیلی فوجی وہاں بار بار چڑھائی کر رہے ہیں، دونوں اطراف کے عوام میں بہت اشتعال ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا شمار بھی محض ایک بد نصیب مردہ سیاح کے طور پر ہو“

اسے جانے دو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو وہ تمہارے منع کرنے سے رکنے والا نہیں۔ ڈاکٹر کلور نے بالکونی میں داخل ہوتے ہوئے اسے تنبیہ کی۔ میری پسندیدہ اطالوی روسٹیڈ بلیک کافی کی پیالیاں اس نے ٹرے میں سجا رکھی تھیں۔

”مسجد اقصیٰ تم لوگوں کے ہوش و حواس پر کیوں اس بُری طرح طاری ہے؟ میں نے بھی شرارتاً اسے چھیڑنے کے لیے پوچھا۔ ہم مسلمانوں نے تمہارے رونے اور گناہ معاف کرانے کے لیے ایک پوری دیوار گریہ چھوڑ دی ہے۔ تم اگر مسجد اقصیٰ کو چھوڑ دو تو مسلمانوں سے آدھی دشمنی تمہاری فوراً ختم ہو جائے گی۔“

ڈیوڈ نے اپنی بیوی پر ایک محتاط باخبر نگاہ ڈالی اور آہستہ سے ایک آہ بھر کر کہنے لگا کہ ”اس بارے میں ہمارا نقطہ نظر تم سے بہت مختلف ہے۔“

”ہم سے کیوں، یہودی تو ایک دوسرے سے بھی اختلاف کرنے سے نہیں چوکتے“ میں کہاں دم لینے والا تھا۔ میری بات سن کر ڈاکٹر کلور کھل کھلا کر ہنس پڑی اور کہنے لگی ”بات تو تم ٹھیک ہی کرتے ہو مگر اس کو سن لو گے تو تمہاری معلومات میں اضافہ ہوگا۔“

ڈیوڈ نے کافی کا بڑا سا گھونٹ لیا اور بتانے لگا کہ ”ہماری مقدس کتاب تلمود (بمعنی ہدایات) میں لکھا ہے کہ موجودہ عہد کی کل میعاد ہمارے کیلنڈر کے حساب سے 6000 سال ہے۔ اس کے بعد ہمارے مسیح موعود Mossiach کو آنا ہے۔ اس وقت تک 5776 برس بیت چکے ہیں۔ اب کل 224 برس ہی اس وعدے کے پورے ہونے میں باقی ہیں۔ پھر ساری دنیا یہودی بن جائے گی۔ دنیا بھر سے یہودی اسرائیل میں آن کر آباد ہو جائیں گے اور سلطنت داؤد (Kingdom of David) دوبارہ اپنی آب و تاب سے قائم ہو جائے گی۔ یہ کہہ کر اس نے کسی متوقع سوال کے لیے میری جانب دیکھا۔“

یہاں یہ وضاحت لازم ہے کہ بائبل کی پہلی پانچ کتابیں جنہیں توریت کہا جاتا ہے۔ اُن میں آمد مسیحا کا کوئی ذکر نہیں۔ البتہ تیرھویں صدی میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے یہودی ہسپانوی معالج موسیٰ بن مامون (Rambam) نے جو تیرہ عقائد وضع کیے اور چودہ جلدوں کی اس کی وضع کردہ تلمود میں مسیح موعود کا ذکر ہے۔ اہل یہود کی وہ دعا جسے یہ ”شمونے عسری“ کہتے ہیں یہ کنیسہ synagogue میں کھڑے ہو کر دن میں تین دفعہ پڑھی جاتی ہے۔ اس میں مسیح موعود کی آمد، دنیا بھر میں موجود یہودی مہاجرین کی اسرائیل واپسی، ان کی شرعی عدالتوں کا قیام، اہل یہود کے لیے دور خوش حالی و فراوانی، مردوں کا دوبارہ جی اٹھنا، انصاف کی برتری، ہیکل سلیمانی کی تعمیر اور سلطنت داؤد کا قیام لازمی جز ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اہل یہود میں کسی شخص کو دعویٰ مسیحائی جائز نہیں، نہ ہی اسے وہ وقت ظاہر کرنا ہے جس میں اس کی آمد ہوگی۔ مسیحا کا اگر مشن ہے تو وہ اس کی موت سے پہلے مکمل ہو جائے گا۔ لیکن اگر وہ خود مشن کی تکمیل سے پہلے دنیا سے سدھار جائے تو وہ مسیحا نہیں تھا۔ یہودیوں نے اس معاملے میں بہت احتیاط رکھی ہے کیوں کہ اٹھارویں صدی میں ان کا ایک بڑا ربی

Shabbatai Tzvi جس نے مسیحائی کا دعویٰ کیا تھا وہ مسلمان ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی بہت سے یہودی بھی دائرہ اسلام میں آگئے۔ اس کے باوجود مسلمانوں کے کچھ فرقوں کی طرح یہ بھی مسیحائی آمد کا بڑے شد و مد سے انتظار کرتے ہیں۔

آئیے دوبارہ ڈاکٹر کلوری کی بالکونی میں بیٹھے اس کے انتہائی با علم شوہر ڈیوڈ سے سلسلہ تکلم جوڑتے ہیں۔ میں نے اسے چھیڑتے ہوئے پوچھا کہ ہم مسلمان اور ہماری یہ مسجد اقصیٰ آپ کے اس سہانے خواب کی راہ میں کیسے رکاوٹ بن رہی ہے یہ تو مجھے سمجھائیں؟

- ”ہمارا معبد ثلاثہ Third Temple یعنی ہیکل سلیمانی عین اس جگہ تعمیر ہونا ہے جس ٹیلے پر مسجد اقصیٰ قائم ہے۔ یہ منصوبہ مسیح موعود کے آمد سے پہلے پایہ تکمیل تک پہنچانا ضروری ہے۔“

اس کے جملے بتدریج معذرت خوانہ سرگوشی میں بدل گئے۔ ڈاکٹر کلور نے بھی ایک مہذب انداز سے نگاہیں کسی اور جانب مرکوز کر لیں۔ ایک ناآسودہ سی خاموشی ماحول پر چھا گئی۔

”اس طرح تو تمہارے پاس کل 224 برس ہی باقی رہ گئے ہیں؟“ میں نے بھی ایک خفیف طنز کیا۔ اس نے بھی یہ سن کر اثبات میں سر ہلادیا۔ میں نے ڈاکٹر کلور کی جانب ایک نگاہ ڈالی جس کی خاموشی میں ایک گہری دوست کی ایسی مفاہمت بھری معنی آفرینی تھی جو آنے والے خطرات کا بہت دھیمے سے پتہ دے رہی۔

”اگر ایسا ہے تو مجھے جلد ہی مسجد اقصیٰ دیکھ لینی چاہیے“



موضوع کی یہ تبدیلی ڈاکٹر کلور کی آنکھوں میں میرے لیے ستائش کے نئے رنگ بکھیر گئی۔

میزبانوں سے جلد ہی رخصت ہو کر میں ہوٹل کے لیے رخصت ہو گیا۔ تل ابیب کی گلیوں پر نیند کا خمار آہستہ آہستہ طاری ہو رہا تھا۔ ایک بوڑھا عرب کسی پارٹی کی ترک شدہ باقیات سمیٹ کر کچرا جمع کر رہا تھا۔ بجیرہ روم بھی شانت تھا۔ فضا میں برسات کی سوندھی سوندھی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک جیتا جاگتا مچلتا ہوا شہر اب ادھ مواہو کر خواب غفلت میں لپٹ گیا تھا۔

راستے میں ہماری کار کو تین چیک پوائنٹس پر روکا گیا۔ میرے بارے میں سنتریوں کے چہرے پر اس وقت نرمی آ جاتی تھی جب انہیں میرے سیاح ہونے کا اطمینان ہو جاتا تھا۔ وائن نے تیسری چیک پوسٹ سے گزرتے ہی کار کے عقبی شیشے سے مجھ پر گہری نگاہیں ڈالتے ہوئے ہنستے ہوئے انکشاف کیا کہ وہ مجھے اس لیے روک رہے ہیں کہ میں شکل سے عربوں کی مانند ناقابل اعتماد لگتا ہوں۔ میری خاموشی نے اس کی طبع تفنن کو آلودہ کر دیا۔

اس نے میرے لیے ڈرائیور کا پہلے سے بندوبست کر لیا تھا۔ وہ اسی کا دوست تھا۔ مجھے صبح وہ آٹھ بجے ہوٹل سے یروشلم لے جانے کے لیے آئے گا۔ مجھے اسے 350 شیکل دینے ہوں گے۔ اسرائیل کی یہ کرنسی ہمارے 11000 روپوں کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ آٹھ بجے تو جلدی ہے میں سونا چاہتا ہوں، وہ دس بجے آئے گا تو میرے لیے بہتر ہے۔

لابی سے کمرے تک میرے ذہن میں ڈیوڈ کی بات کی چنگاریاں چٹاخ پٹاخ بھڑک رہی ہیں۔ وہی ہیکل سلیمانی کی تعمیر۔ تاریخ کے گم شدہ خزانوں کی تلاش میں مسجد اقصیٰ کی بنیادوں کی کھدائی کے خبریں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس کی بنیاد ایسی کمزور ہو جائے کہ یہ خود بخود فلسطینوں کی مانند کھڑے کھڑے ڈھ جائے تاکہ اس کے بلے سے وہ یہ ہیکل کی تعمیر کر سکیں۔

سوالات کا ایک طوفان میرے ذہن میں اٹھ رہا تھا کہ کون ہے جو مسلمانوں کے اس قبلہ اول کی حفاظت کر رہا ہے۔ دنیا کی تیسری بہترین اسرائیلی فوج کے مقابلے پر کون سینہ سپر کھڑا ہے۔ یہ جھلسے ہوئے، مرجھائے اور کچلے ہوئے پچاس ہزار فلسطینی جو وہاں آباد ہیں۔ وہی حقیقی باشندے جن کے جوانوں کی اکثریت یا تو ٹور گائیڈ ہے یا ٹیکسی ڈرائیور۔ میرے بستر استراحت پر نیند میں ڈوبتے ہوئے مجھے لگا کہ کل سو میل کے فاصلے پر تاریخ کروٹیں لے کر ایک بڑی جنگ (جسے عرب ہر مجدون اور باقی سب Armageddon کہتے ہیں) کی تیاریاں بڑی خاموشی سے شروع ہو گئی ہیں۔

نیند کے آتے آتے مجھے ایک افریقی زولو شامن (جادوگر اور درویش) کی بات یاد آتی رہی کہ ”اختتام ہماری توقع سے جلدی ہو جاتا ہے۔“

\*\*\*\*\*

## پارٹ: 4

ہوٹل میں ناشتہ کی میز پر مغربی اور عربی طعام کی بھرمار تھی۔ دس بجے مجھے لینے ڈاکٹر کارلا کے میاں ڈیوڈ کا ڈرائیور دوست ایلی آگیا۔ تل ابیب سے یروشلم کی شاہراہ قدرے پرسکون تھی۔ ایلی میرے مزاج کا ڈرائیور تھا۔ دھیمہ، خوش مزاج، پر اعتماد اور احتیاط سے گاڑی چلانے والا۔ والدین کا تعلق روس کی ریاست جارجیا سے تھا۔ 12 سال کی عمر میں والدین کے ساتھ اسرائیل آگیا تھا۔ اب پچھلے چالیس سال سے یہیں پر مقیم ہے۔



یروشلم تل ابیب سے کتنا دور ہے۔؟ میں نے اپنی معلومات میں اضافے کے لیے پوچھ لیا۔  
”85 کلومیٹر اس کا جواب مختصر تھا۔“

سو ہم ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ جائیں گے میں نے بھی اندازہ لگانے میں کچھ عجلت کا مظاہرہ کیا۔

”جی نہیں جہاں پر قیام ہے وہاں پہنچتے پہنچتے ہمیں دو گھنٹے لگیں گے۔“ اس نے بھاری مشرقی یورپی لہجے میں شکایتاً بتایا۔

”ڈیوڈ کہہ رہا تھا آپ ایک ڈاکٹر ہیں“ ڈرائیور نے پوچھا۔ میرا جواب اثبات میں پا کر اس نے اگلا سوال بھی داغ دیا کہ ”آپ نے مشرقی یروشلم میں قیام کرنا کیوں بہتر جانا؟“

میں نے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا کہ شہریوں کے درمیاں رہنے میں مجھے اچھا لگتا ہے۔ مجھے اس کے سوال کی کاٹ سمجھ آچکی تھی۔ مشرقی یروشلم مسلمانوں کا علاقہ اور ہنگاموں کا مرکز ہے۔ سیاح وہاں قیام کرنا ناپسند کرتے ہیں کیوں کہ چوبیس گھنٹے اسرائیلی فوج وہاں ڈیرے ڈالے رہتی ہے۔ شاہراہ سلیمان پر میرے گولڈن وال ہوٹل کا مالک مسلمان تھا اور ایل کی تشویش بجا تھی۔ مجھے خدشہ ہوا کہ اسے مسلمانوں کے علاقے میں گاڑی لے جانے میں کچھ تامل ہے۔ میرا مسئلہ یہ تھا کہ مسجد اقصیٰ کے قریب ترین یہ واحد قابل قیام ہوٹل تھا۔

”مجھے آپ مشرقی یروشلم سے پہلے اتار دو، میں کسی عرب ڈرائیور کی ٹیکسی میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ میں نے اپنی جانب سے ایک مفاہمت کا راستہ چن لیا۔

”ارے نہیں میرے وہاں بہت سے عرب دوست ہیں۔ میں تقریباً ہر ہفتے ہی وہاں جاتا ہوں۔ میں عربی بھی بول سکتا ہوں، مجھے آپ کی جانب سے فکر ہے۔

میں نے جب اللہ مالک کہا تو جواباً اس نے بھی وہی الفاظ دہرائے اور مجھے یقین آگیا کہ وہ عربی مجھ سے بہتر ہی بولتا ہوگا۔

کار کا شیشہ نیچے اتارتے ہی مجھے تل ایب کی بو جھل دھواں دھار ہوا کے بجائے ٹھنڈے، خوشبودار جھونکے سانس کے ساتھ اپنے وجود میں گھلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ یروشلم اسرائیل کا دار الخلافہ، تل ایب سے ایک ہزار میٹر اوپر ہے۔ تل ایب کے جغرافیہ میں آپ کو ایک بنجر سی اداسی محسوس ہوتی ہے جو یروشلم تک آتے ٹھنڈک بھری ہریالی میں بدل جاتی ہے۔ یہاں تاریخ، گھاس، درخت، جھاڑیاں اور عربوں کے خون کی ہر دم تازہ نئی فصل ایک ساتھ اگتی ہے۔ انسانی خون اور ہلاکت میں بسی یہ ہریالی پھر بھی دل کو بھلی لگتی ہے۔

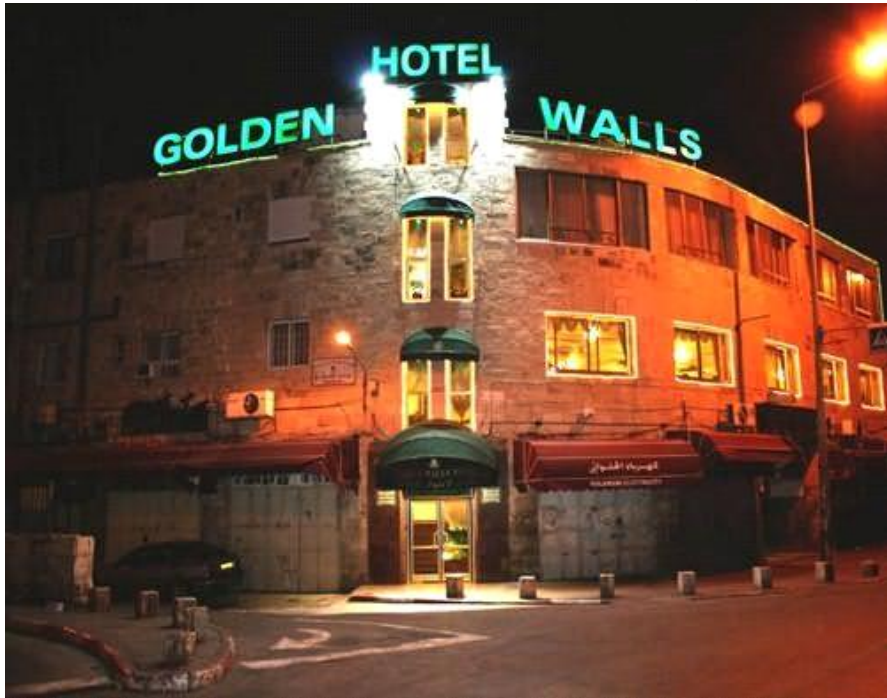
شہر کے عین قریب چیک پوائنٹ پر جب ہمیں روکا گیا تو کئی گارڈ ایل کو جانتے تھے اور وہ محو کلام ہوئے تو میں بھی باہر کا منظر دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ نگاہوں کے اس جائزے کو اچانک ایک جھٹکا لگا۔ ایسا لگا کہ کوئی بجلی سی کوند گئی ہے۔ سامنے ایک سبز بورڈ پر انگریزی، عربی اور عبرانی میں AL-QUDS AS-SHARIF درج تھا۔

یروشلم (بمعنی گہوارہ امن) کا نام حضرت داؤد علیہ سلام نے جیسیس (عربی یسوس) کی ایک چھوٹی سی بستی کو حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے 1000 سال پہلے فتح کرنے کے بعد رکھا۔ اسے انہوں نے اپنی راج دھانی بنادیا۔ یہ بھی تاریخ کا عجیب و غریب واقعہ ہے کہ اس دارالامان کا 23 مرتبہ محاصرہ کیا گیا۔ 52 مرتبہ اس پر فوج کشی ہوئی اور 44 دفعہ اس پر قبضہ ہوا۔





شہر کی سلطان سلیمان اسٹریٹ پر پہلا گمان تو پنڈی کے راجہ بازار کا گزرتا ہے۔ کم سن بچوں کی طرح مین اسٹریٹ سے دامن چھڑا کر بھاگتی ہوئی شریرتنگ لگیاں۔ راجہ بازار بد صورت ہے، گندا ہے کسی نشئی فقیر کی طرح۔ سلیمان اسٹریٹ ایک ایسی بیوہ کی مانند ہے جس کو تاریخ نے حسن بزرگی اور رکھ رکھاؤ دے دیا ہے اور مظلومیت نے اس کے سر کے چاندی جیسے تاروں پر اپنا سفید دوپٹہ ڈال دیا ہے۔ گزرتی ہوئی شور مچاتی گاڑیاں، چھوٹے چھوٹے دھابے۔ اس کے دمشق دروازے کے ساتھ ہی میرا گولڈن وال ہوٹل تھا۔ یہ ہوٹل ایک خاندان مل جل کر چلاتا ہے۔ مسرور اور خوش اخلاق رفیق نام کے منیجر نما مالک نے مجھے خوش آمدید کہا۔ کمرے چھوٹے مگر بہت صاف ستھرے تھے 110 ڈالر یومیہ کرائے میں عربی ناشتہ بھی شامل تھا۔





میرے کمرے کی کھڑکی سے یروشلم شہر کی قدیم فصیل کا منظر ایک بلاوا تھا۔ کمرے سے نکل کر میں جب استقبالیے پر آیا تو منیجر رفیق صاحب کی چائے، کافی کی پیشکش کا میں نے صرف ایک جواب دیا ”اقصی“۔

اُن کا رویہ پدری شفقت سے لبریز تھا۔ اور سوال بھی۔ مجھے اچھا لگا۔ میرے وطن پاکستان کا نام جان کر اس کے چہرے پر دھنک رنگ بکھر گئے۔ جواب میں اس نے بھی جب لفظ پاکستان کو دہرایا تو مجھے وہ نام اس کے عربی لہجے میں ایک باعث اطمینان و اعتماد لگا۔ اس نے فوراً جذبات سے مغلوب ہو کر کہا واللہ حبیبی آپ پہلے پاکستانی ہیں جو ہمارے مہمان بنے ہیں۔ اور ساتھ ہی اس نے ایک نعرہ مستانہ لگایا جس کو سن کر ہوٹل کا سارا عملہ کاؤنٹر پر پہنچ گیا۔ یہ عملہ کیا تھا۔ ان کے بھائی بھابھیاں، خالہ پھوپھیاں، بھانجے، بھتیجیاں اور کزن اور انہیں کہا کہ میرا بھائی کاشف ہمارے ہوٹل میں پاکستان سے آنے والا پہلا مگر اللہ نہ کرے آخری مہمان ہو۔ سو اس کے قیام کو ایسا سہانا اور پر لطف بنا دو کہ یہ ساری عمر اسے یاد رکھے۔ اُس نے ہوٹل اس بھلے چنگے خاندان کے باقی افراد کے حوالے کیا اور میرا ہاتھ تھام کر سوئے ”اقصی“ چل پڑا۔

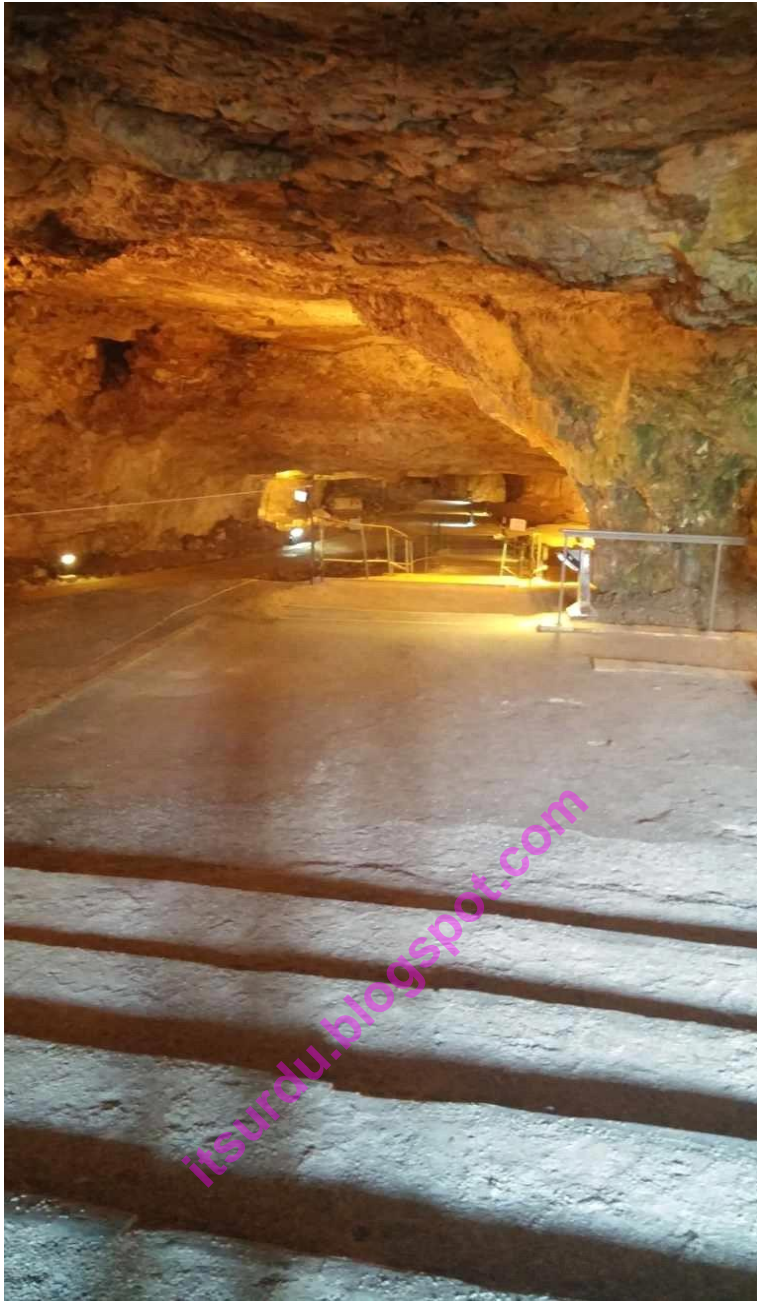
”برادر رفیق میں مسجد اکیلا جانا چاہتا ہوں“

وہ میرا مطلب سمجھ گیا اور ہوٹل کے باہر لے جا کر مجھے بتانے لگا کہ تیسرے سنگل سے بائیں ہاتھ مڑ جاؤ۔ پرانے شہر میں دمشق گیٹ سے داخل ہو جاؤ اور سیدھے چلتے چلے جاؤ۔ اور پھر ”میں نے وضاحت مانگی۔

”ادھر ادھر مت دیکھو وہ تمہیں خود ہی ڈھونڈ لے گی۔“ اس نے مجھے بہت آہستہ سے انسانوں کے ایک سمندر میں دھکیل دیا۔

65 ممالک کی سیاحت نے مجھے ہر طرح کے معاشرے اور افراد سے ملنے کا موقع دیا ہے لیکن تاریخ کا ایک بوجھ مجھے اس شہر میں محسوس ہوا۔ ایک طرف گورے سیاحوں کی بھرمار تھی جنہیں ٹور گائیڈ اپنی مرضی سے ہانک رہے تھے۔

ایسا ہی ایک متوازی سیل رواں شور مچاتے، سیلفیاں لیتے، فلیش چمکاتے چینی سیاحوں کا بھی تھا۔ ان کے پاس بھی جاپانیوں کی طرح بہت دولت بہت جلدی آگئی ہے۔ اسی اور نوے کی دہائی میں ہر جگہ جاپانی سیاحوں کے غول غول دکھائی دیتے تھے۔ اب جاپان میں بوڑھے زیادہ اور نوجوان کم ہو گئے ہیں تو سیاحوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہو گئی ہے۔ بڑھاپے میں جو مزہ گھر میں رہنے میں آتا ہے وہ شاید کسی اور عمر میں نہیں آتا۔ اپنے سیاحت کے تجربے میں مقامات مقدسہ اور عبادات پر میں نے سب سے بُرا طرز عمل چینیوں کا دیکھا۔ مثلاً ال Golgotha یعنی وہ مقام جہاں حضرت عیسیٰ کو ایک روایت کے مطابق مصلوب کیا گیا تھا، وہاں تقدس اور خاموشی لازم امر ہے مگر چینیوں کی بد تہذیبی وہاں بھی بہت کھل کر عیاں تھی اور گراں گزر رہی تھی انتہائی مضحکہ خیز انداز میں یہ گروپس شور مچا کر سیلفیاں اتار رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے لگا کہ دولت سے کلاس اور سلیقہ نہیں آتا، کم از کم فوراً تو ہر گز نہیں آتا۔



د مشق دروازے سے کچھ ہی فاصلے پر میری نگاہ ایک بورڈ پر پڑی، جس پر درج تھا 'Cave of Zedekiah, Solomon Quarry' بورڈ دیکھتے ہی مجھے سرجری کے استاد مسٹر کاٹز یاد آ گئے وہ فری میسن تھے۔ انہوں نے مجھے کہا تھا کہ ”تمہارے دل کا ابن بطوطہ تمہیں یروشلم لے جائے تو میری جانب سے غار ڈیڑے کاہیا میں ایک شمع روشن کر دینا۔ یہ مت پوچھو کیوں؟“ جب میں نے وہاں داخل ہونے کی کوشش کی تو نیم خوابیدہ گارڈ نے ایک بے لطف سی نگاہ مجھ پر ڈالی اور داخلے کے لیے اس نے 16 شیکل کی فیس طلب کی۔ اندر کوئی نہ تھا۔ مجھے کوئی شمع بھی نہ ملی کہ روشن کرتا، میں نے ایک غائبانہ معذرت ڈاکٹر کاٹز سے کی اور چل پڑا۔ بہت بعد میں مجھے علم ہوا کہ یہ جگہ خفیہ مغربی تنظیم فری میسن کے لیے بہت اہم ہے۔ یہاں سے پتھر کھود کر ہیکل سلیمانی تعمیر ہوا تھا۔ قدیم فری میسن یہیں پر اپنے خفیہ اجلاس منعقد کرتے تھے اور ان کا سالانہ اجتماع تو اسی مقام پر بڑا دھوم دھڑکے سے منعقد ہوتا تھا۔

\*\*\*\*\*

یروشلم جسے حضرت داؤدؑ نے فتح کر کے دارالامان کا نام دیا تھا، آپ کو الہ دین کے غار کی یاد دلاتا ہے۔ اس کی گلیاں رقیب کے دل کی مانند تنگ، دکانیں سامان سے لدی پھندی مگر معشوق کے رخسار کے تل کی مانند سمٹی سمٹی سی ہیں۔ دکانداروں کی آوازیں اور ان کے بے قابو ہاتھ، دونوں ہی زبردستی آپ کے پیچھے لگ جاتے ہیں، دامن تھام لیتے ہیں۔ انہیں دکانوں کے اوپر قدیم رہائش کدے بھی ہیں جن کی کھڑکیاں چھوٹی اور چلمنیس حریری (ریشمی) ہیں۔ گھروں کی سیڑھیاں پتھریلی مگر گھس چکی ہیں۔ گھروں کے درمیان عمر رسیدہ افراد کے دانتوں میں فاصلے جتنی چھوٹی چھوٹی گلیاں ہیں۔ ان میں ہر صبح فلسطینی خواتین قرب وجوار کے علاقوں سے اپنی زرعی پیداوار فروخت کرنے آ جاتی ہیں۔ اسی انبوہ تاجراں میں طلسم کدہ حیرت میں کھوئے ہوئے جوق در جوق سیاح۔ انہیں حیرانی اس بات کی ہے کہ بوڑھا وقت اپنی تمام تر تھکاوٹ اور نحیف ہونے کے باوجود ان مقامات پر بونگ اور ایئر بس کا مسافر نہیں بلکہ اب بھی پیدل ہی چل رہا ہے۔ اسے اپنی منزل پر پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں۔



میں اب اپنے ہوٹل سے آدھا کلومیٹر دور چلا آیا ہوں۔ راستے میں تین چیک پوسٹ آئیں۔ چست نوجوان، مسرور مگر بے حد سنجیدہ اسلحہ سے لدے ہوئے اسرائیلی سپاہی کھڑے ہیں۔ اسرائیلی سپاہی اگر ڈیوٹی پر نہ بھی ہوں تو انہیں اسلحہ لازمًا لے کر چلنا ہوتا ہے۔ چونکہ فوجی

ڈیوٹی ہر نوجوان کے لیے لازم ہے لہذا آپ کو بازار اور دیگر پبلک مقامات پر بھی ایسے مرد و عورت فوجی دکھائی دیں گے جن کے شانے سے جدید ہتھیار لٹک رہے ہوتے ہیں۔ ان تینوں چیک پوسٹوں پر کسی کو روکا نہیں گیا۔ البتہ کچھ 150 میٹر جا کر مجھے جب روکا گیا تو سپاہی نے پہلے عبرانی اور پھر عربی میں بات کی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں تو ایک سیاح ہوں۔ یہ معاملہ مسجد اقصیٰ سے کچھ دور ہی پیش آیا تو اس نے بتایا کہ یہ مقام قبۃ الصخرۃ یا طلائئ گنبد صرف مسلمانوں کے لیے ہے۔ غیر مسلم یہاں سے داخل نہیں ہو سکتے۔ ان کے وہاں جانے کا راستہ مغربی دروازے سے دیوار گریہ کے نزدیک سے ہے اور وہ بھی مخصوص اوقات میں۔

”میرا نام مصطفیٰ ہے۔“

میں اسے اپنے مسلمان ہونے کا یقین ایک غیر مسلم ملک سے جاری کردہ اپنا پاسپورٹ دکھا کر دلاتا ہوں اور وہ مجھے آگے بڑھنے کی اجازت دیتا ہے۔ اس دوران میرے دماغ میں ان خدشات کا ایک طوفان اٹھ چکا ہے کہیں ہنگاموں کی وجہ سے ان کم بختوں نے مسجد اقصیٰ میں ہی داخلے کی ممانعت نہ کر دی ہو۔

سو میٹر دور جا کر پھر ایک ایسا ہی مرحلہ درپیش آتا ہے۔ مجھے اپنا سفر جاری رکھنے کی اجازت مل جاتی ہے اور میں لکڑی کے ایک قدیم بڑے دروازے سے جو نہی اندر داخل ہوا۔ ایک نوجوان میری جانب لپک کر آتا ہے اور چیخ کر مجھے رک جانے کا کہتا ہے۔ ”مسلم؟“ اس کا سوال منکر نکیر جیسا مختصر اور میرا جواب نفس مطمئنہ والہ الحمد للہ۔ میرا جواب سن کر اس کے چہرے پر مسرت نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ کہاں سے؟ یہ سوال میرے لیے متوقع بھی اور باعث تفاخر بھی۔ مسجد اقصیٰ کا آخری سیکورٹی مرحلہ اسرائیلی عرب مسلمانوں کے حوالے سے ہے۔ مبادا کوئی یہودی سیکورٹی گارڈز کو دھوکا دے کر آجائے۔ یہاں دین پر بھی چند سوال کر لیے جاتے ہیں۔

میرا خیال تھا مجھ سے وہ اسرائیلی عرب گارڈ یا تو آیت الکرسی کے بارے میں کرے گا یا دعائے قنوت یا سورۃ الاخلاص کی تلاوت کی فرمائش کرے گا۔ جب میں نے اسے اپنے ملک کا نام پاکستان بتایا تو اس نے کسی تکلف اور توقف کے بغیر میرے گال کا بوسہ لے لیا۔ تب مجھے لگا کہ یورپ اور دنیا کے دیگر ممالک میں خاکسار نے کتنا وقت ضائع کیا، پاکستان کا نام زور زور سے لینے سے تو یہ گنوائے ہوئے بوسے مل جاتے میری آنکھیں بھی اس وقت نم آلود ہو گئیں جب میں نے اس بوسے کے بعد اس عرب گارڈ کی آنکھ میں آنسو دیکھا۔ دل میں بے اختیار یہ خیال کوندا کہ کیا پاکستان اور اس کی فوج اب بھی عالم اسلام کی آخری امید ہے۔ ”میرے بھائی مسجد اقصیٰ میں خوش آمدید۔“ اس کا آنسوؤں سے نم آلود یہ جملہ مجھے پاکستان سے اس سمیت ہم سب کی امید اور موجودہ حکمرانوں اور اشرافیہ کے طرز معاشرت پر ندامت، دونوں سے بھگو گیا۔ اللہ نے کیسا اعلیٰ ملک و منصب دیا ہے اور ہم نے اس کا کیا بنا کر رکھ دیا ہے۔





اس سے رخصت ہو کر میں چند قدم آگے بڑھا تو ایک ایسے احاطے میں آن پہنچا جس کا رقبہ تو یہی کوئی 35 ایکڑ ہے مگر جس کی تاریخ صدیوں پر محیط واقعات سے لدی پھندی ہے۔ جہاں سے مسلمان داخل ہوتے ہیں وہاں سے اندر آن کر دیکھیں تو آپ کی نگاہ مسجد الاقصیٰ (اقصیٰ بمعنی جو بہت دور ہو) پر نہیں بلکہ سنہری گنبد والے قبۃ الصخرہ پر پڑتی ہے۔ قبہ عربی میں ٹیلے کو کہتے ہیں۔



Interior photographs of and in the Qubbat al-Sakhra (Dome of the Rock), Masjid al-Aqsa, Haram al-Sharif, Jerusalem

اسے مشرق وسطیٰ کی سب سے مشہور علامتی نشانی مانا جاتا ہے۔ قدرت الہی کا یہ بھی طرفہ تماشا ہے کہ اسرائیل کی سب سے اہم شناخت مسلمانوں کی بنائی ہوئی ایک عمارت یعنی یہ سنہری گنبد ٹہرا جسے عرب سے باہر تعمیر شدہ مسلمانوں کی پہلی عمارت کہا جاتا ہے۔ ایک غلط فہمی کا ازالہ یہاں بہت ضروری ہے۔ یہ عمارت کوئی مسجد نہیں بلکہ ایک ایسا خوبصورت احاطہ ہے جس کے سنہری گنبد کے عین نیچے وہ پتھریلی چٹان (صخرہ) ہے جہاں سے نبی کریم ﷺ معراج پر تشریف لے گئے تھے۔ یہاں آنے والے نوافل بھی پڑھتے ہیں اور قرآن کریم بھی۔ یہاں بھی صرف مسلمان ہی آ سکتے ہیں۔ یوں اس کی مسلمانوں کے ہاں بڑی خصوصی اہمیت ہے۔

اسکی ہمارے فرسٹ کزن اہل یہود کے ہاں بھی بڑی اہمیت ہے۔ وہ اسے Mount Moriah کے نام سے پکارتے ہیں۔ اسی چٹان کو وہ دنیا کا مقام آغاز سمجھتے ہیں۔ ان کے ہاں قربانی کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بڑے بیٹے اسحاقؑ جن کا لقب اسرائیل تھا انہیں اس پتھر پر لٹایا تھا کہ کنیز کے بیٹے حضرت اسمعیلؑ کو۔ حضرت اسحاقؑ ان کی اہلیہ حضرت سارہ کے بطن سے تھے جو ایک شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ حضرت اسمعیلؑ کی والدہ حضرت حاجرہ (Hagar) ہیگر (حضرت سارہ کی کنیز تھیں۔ اسی لیے مسلمانوں کو وہ حقارتاً ہیگر آئٹس (Hagarites) بھی کہتے ہیں۔ دو مواقع پر فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے پاس آئے تھے۔ دوسری دفعہ تب جب انہیں ان کے کزن حضرت لوطؑ کی بستی سدوم کو برباد کرنا تھا۔ دونوں دفعہ آپ یعنی حضرت ابراہیمؑ کو بیٹوں کی پیدائش کی نوید بھی سنائی گئی تھی۔ حضرت اسمعیلؑ جو مسلمانوں کے عقیدے کے حساب سے بڑے بیٹے تھے ان کے لیے قرآن غلامِ حلیم (سورۃ الصفات آیت نمبر 101) یعنی نرمی اور خوش خلقی کے وصف سے مزین) کی اصطلاح استعمال کرتا ہے، یہ خوش خبری انہیں آگ سے برآمدگی کے بعد سنائی گئی تھی۔ حضرت اسحاقؑ جنہیں اسرائیل کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہودی اُن سے اپنا نسلاً رشتہ جوڑتے ہیں۔ ان کے لیے قرآن الکریم غلامِ حلیم (سورۃ الحجر آیت نمبر 53) یعنی صاحب علم کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ ان کے ہاں یہ تفاخر بھی بہت عام ہے کہ تین ہزار برسوں سے نہ نام، نہ زبان، نہ علاقہ کچھ بھی انہوں نے نہیں بدلا۔

قبۃ الصخرہ کو آنحضرت محمد ﷺ کی وفات یعنی 632 عیسوی کے ٹھیک ساٹھ سال بعد تعمیر کیا گیا تھا۔ اسے اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے خانہ بربادی کے دور ابتلا میں اس وقت تعمیر کیا جب مسلمان مملکت اسلامیہ کا دار الخلافہ مدینہ سے دور پہلے کوفہ اور بعد میں دمشق میں قائم کرنے کی فاش غلطی کر بیٹھے تھے۔ اس کے بعد اسلامی ریاست مڑ کر کبھی مدینہ نہ لوٹ پائی۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ (حضرت ابو بکرؓ کے نواسے اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بھانجے یعنی ان کی ہمیشہ حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ کے صاحب زادے تھے) نے حضرت حسین ابن علیؓ کی طرح یزید کی بیعت سے انکار کیا تھا۔ ان کی شہادت کے بعد اہل مکہ نے ابن زبیرؓ کو اپنا خلیفہ بنایا تھا۔ مروان یزید کی تین برس کی حکمرانی کے بعد اس کی وفات پر دمشق میں خلیفہ بنا تھا۔ عبداللہ بن زبیرؓ سے اس کی مکہ



اور مدینہ پر قبضے کی جنگ جاری تھی۔ انہیں بالآخر حجاج بن یوسف کی ہاتھوں جام شہادت پینا پڑا جسے اموی خلیفہ عبدالملک نے مکہ اور مدینہ فتح کرنے بھیجا تھا۔

قبۃ الصخرۃ ایک شاندار عمارت ہے جسے ایک انسانی تعمیر شدہ ٹیلے (قبہ) پر بنایا گیا ہے۔ مسلم مورخ مقدسی سے روایت ہے کہ اس نے اپنے چچا سے پوچھا تھا کہ اس شاندار عمارت کی ضرورت مسلمان خلیفہ عبدالملک اور اسے کے بیٹے ولید بن عبدالملک کو کیوں پیش آئی تھی تو جواب ملا کہ شام اور فلسطین میں عیسائی گرجے دیکھ کر وہ بھی چاہتا تھا کہ ایسی ہی کوئی شاہکار عمارت وہاں بنائے۔ اس کے مخالفین یہ بھی ایک توجیہ پیش کرتے ہیں کہ چونکہ مکہ المکرمہ ان باپ بیٹوں کے تسلط میں نہ تھا لہذا وہ اپنا ایک مرکز تقدس تیسرے کسی ایسے مقام مقدس جو پہلے دو مقامات کی یاد کچھ دن تک بھلا دے بنانا چاہتے تھے۔ مسجد اقصیٰ انہیں بہت سادہ لگی۔ وہ دینی حوالے سے اس میں کوئی ترمیم بھی نہ چاہتے تھے۔ لہذا اس کے عین مقابل حرم شریف کے صحن کے دوسری طرف انہوں نے اس مقدس چٹان کو چنا اور یہ سنہری گنبد بنا ڈالا۔ (اس پر مزید گفتگو بعد میں)

دوران تعمیر اس کے سامنے Church of the Holy Sepulchre، اور لائیڈ اور ایڈیسا کے کلیسا کی عمارت کی مثالیں تھیں۔ مسلمانوں میں عالی شان مساجد اور محلات و مقابر تعمیر کرانے کا رجحان وہیں سے پڑا۔ اس سے قبل مسلمان اپنے طرز رہائش میں بہت سادہ اور جذبوں میں بہت شدید اور سچے تھے بعد کہ مسلمان اس کے بالکل برعکس نکلے۔ وہ امویوں، عثمانیوں اور مغلوں کی طرح پر تعیش طرز زندگی گزارتے تھے اور ان کی زندگی دین سے بہت پرے پرے گزرتی تھی۔

اس قبۃ الصخریٰ کی تعمیر جس کھلے صحن (کمپاؤنڈ) میں ہوئی ہے اسے حرم الشریف کہتے ہیں۔ یہاں سے بہت دور ہٹ کر ہی مسجد اقصیٰ، کئی مدارس اور دیگر چھوٹی چھوٹی مذہبی عمارات بھی ہیں۔ یہی وہ احاطہ ہے جس پر یہودی اور مسلمانوں کے کنٹرول کا جھگڑا ہے۔ ان دونوں مذاہب کے پیروکاروں کے لیے یہ بہت ہی اہم مقام ہے۔

دل میں ایک خوف اور میرے قدم بوجھل ہیں۔ اس بچے کی طرح جس کا اسکول میں پہلا دن ہو۔ چار سو میٹر کے بعد میں مسلمانوں کی تیسری سب سے مقدس عمارت کے سامنے ہوں۔ مسجد اقصیٰ بہت سادہ ہے مگر قدرے بڑی۔ میں اپنے جوتے اتار کر جب اندر داخل ہوا تو نبیل انصاری میرے منتظر تھے۔ یہ اس وقف بورڈ کے ممبر ہیں جو اس مسجد کا انتظام چلاتا ہے۔ مسجد اقصیٰ اپنے رقبے میں استنبول ترکی کی بلیو مسجد جتنی ہے۔ سرخ دھاریوں والے قالین اور اونچی چھت سے لٹکتے ہوئے فانوس، چھت کی منڈیروں سے جا بجا کبوتر اڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ میں مسجد میں داخل ہوا تو ظہر کی نماز پڑھی جا چکی تھی۔ ہم ایک کونے میں بیٹھ کر گفتگو کا آغاز کر دیتے ہیں۔

\*\*\*\*\*

ذکر تھا مسجد اقصیٰ میں میرے بزرگ میزباں نبیل انصاری کا۔ سیدی نبیل انصاری اس وقف بورڈ کے ممبر ہیں جو حرم شریف کا انتظام و انصرام سنبھالتا ہے۔

ہم ایک کونے میں گفتگو کرنے بیٹھ گئے۔ وہ بتانے لگے کہ اسرائیلی عربوں کے لیے مسجد اقصیٰ ایک وجود لازم ہے، اس سے وابستگی میں ہی ہمارا مکمل تشخص پنہاں ہے۔ یہ ہم مظلومین کی روحانی پناہ گاہ ہے۔ یروشلم کی بیشتر مسلم آبادی اس کے ارد گرد کے محلوں میں اور یہاں سے دو کلو میٹر دور خالصتاً ایک عرب بستی سیلفان (جسے انگریزی میں Silwan لکھتے ہیں) کی تنگ و تاریک گلیوں اور چھوٹے چھوٹے مکانات میں رہتی ہے۔ ہر مکان میں اوسطاً تیرہ چودہ افراد رہتے ہیں۔ شام ہوتے ہی یہ ساکنان مظلومیت تازہ ہوا کی چاہ میں قبۃ الصخرۃ اور مسجد اقصیٰ کے دالانوں اور پاس پڑوس کے باغیچوں میں آ جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ان کے بچے بھی کھیلتے ہیں یہاں وہ سیاست سے لے کر جدید عربی ادب کے بچے اُدھیرتے ہیں، اور رات کے کسی پہر خاموشی سے گھر لوٹ جاتے ہیں۔ ان فلسطینی عربوں کی اکثریت غربت کے کوہ گراں تلے دبی ہوئی ہے۔ سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان پر بند ہیں اور اس قدر نامساعد ماحول میں کاروبار کے مواقع بھی بہت محدود ہیں۔ ان کی اکثریت دیہاڑی کی مزدوری کرتی ہے۔ بے چاری روز کنواں کھودتی ہے روز پانی پیتی ہے۔ بچوں پر اعلیٰ تعلیم کے دروازے بند ہیں۔ مملکت یہود چاہتی ہے کہ ان کی زندگیاں اس قدر مشکل اور گھٹن زدہ بنادی جائیں کہ یہ تنگ آن کر دوسرے ممالک ہجرت کر جائیں۔ مجھے ان کے جس وصف نے عرق تحسین سے بھگودیا وہ ان کی فیاضی اور نرم دلی ہے۔ ان کی مہمان نوازی ایسی کہ برسات بادلوں کی طرح کھل کر برستی ہوئی۔

نبیل صاحب بھی ان ہی اوصاف حمیدہ سے آراستہ ہیں محبتوں کے مارے۔

فرمانے لگے کہ میرے بھائی مصطفیٰ مجھے اس بات کا بے حد قلق ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت کو اسرائیل آنے کی اجازت نہیں۔ یہاں آنے والے سیاحوں کی بہت بڑی اکثریت غیر مسلم ہے۔ انہیں ہمارے مقامات مقدسہ سے کوئی خصوصی دل چسپی نہیں ہوتی۔ مجھے اس سے بڑھ کر اس بات کا بھی دکھ ہے کہ وہ جو تھوڑے بہت مسلمان یہاں کسی پاسپورٹ کی رعایت سے آتے بھی ہیں تو ان کا رویہ ہمارے بارے میں بہت دلبری کا نہیں ہوتا۔ یہ مسلمان، سفری سہولت کی وجہ سے سیاحوں کے بڑے گروپس میں آتے ہیں۔ ان ٹور آپریٹرز کو اسرائیلی حکومت لائسنس جاری کرتی ہے۔ اس لائسنس کی وجہ سے ان کی سیاحت پر اسرائیلی پروپیگنڈے کی چھاپ ہوتی ہے۔ ان کے تعارفی بیانیے بھی جاری کردہ گائیڈ لائن کے عین مطابق اور بہت محدود اور اسرائیل کی پالیسیوں کے عین تابع ہوتے ہیں۔ وہ اگر ان سے



ذرا بھی روگردانی کریں تو لائنس منسوخ ہو جاتا ہے۔ ایک غیر اعلانیہ پاسداری انہیں اس بات کی بھی کرنی ہوتی ہے کہ مسلم اور غیر مسلم دونوں ہی طرح کے سیاح مقامی مسلمان آبادی کے رابطے میں نہ آئیں۔ انہیں پہلے ہی سے خوف زدہ کر دیا جائے۔

”لیکن ایسا کیوں ہے؟“ میرا اضطراب اور تجسس دونوں ہی بہت نمایاں تھے!

وہ اس لیے کہ ہماری بے بسی اور ان کے مظالم دونوں ہی عالم آشکار ہو جائیں گے۔ ہر ہفتے ان کی جانب سے ہماری اس مقدس عبادت گاہ کی بے حرمتی کا کوئی نہ کوئی واقعہ سرزد ہوتا ہے۔ ہر جمعہ کی صلوٰۃ میں اسرائیلی افواج اندر گھس آتی ہیں تاکہ لوگوں میں خوف و ہراس پھیلے۔ ہم نہتے ہاتھوں سے دنیا کی تیسری طاقتور فوج کا مقابلہ کرتے ہیں۔ میں ایک مجرمانہ خاموشی سے سر جھکائے اس کا دکھڑا سن رہا تھا۔ بہت سارے مسلمانوں کے لیے تو ہم کوئی وجود بھی نہیں رکھتے۔ ان میں سے کچھ مسلمان سیاح جن کے پاس اسرائیلی حکومت کے لیے قابل قبول پاسپورٹ ہوتے ہیں یہاں اپنی قیمتی کاروں میں جمعہ کی نماز پڑھنے آتے ہیں اور ہم پر نگاہ ڈالے بنا چلے جاتے ہیں۔ میرے بھائی تمہیں شاید اس بات کا خیال بھی نہ ہو کہ ہم بھی مسجد اقصیٰ جتنے پرانے مسلمان ہیں۔ اللہ کے اس مقدس گھر کے محافظ۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ ہم قرب و جوار کے عرب ممالک میں ہجرت کر کے نہیں جاسکتے۔ 1967 کی جنگ میں جب اسرائیل نے اردن کے علاقے فلسطین پر قبضہ کر لیا تو ہماری ایک بہت بڑی تعداد عرب ممالک میں جالبی (واضح رہے کہ 1967 کی چھ روزہ جنگ کے بعد اسرائیل نے شام کے علاقے ہضبہ الجولان (Golan Heights)، مصر کے زیر انتظام غزہ کی پٹی، اردن کے زیر انتظام الضفة الغربیہ کا ساڑھے پانچ ہزار کلومیٹر کا رقبہ جس میں رملہ، نابلس، جیرکو، جنین اور ہیبرون جیسے مشہور نام شامل ہیں، ان تمام علاقوں پر قبضہ کیا تھا) ہم نے پھر بھی اس علاقے میں قیام کرنا ہی اپنا فریضہ جانا ہم قدیم فلسطینی مسلمان باشندوں کی موہوم سی مدافعت دنیا کو یاد دلاتی رہتی ہے کہ یہ ہماری سر زمین ہے۔ یہ مقدس عبادت گاہ ہماری ہے۔ ہم یہ کسی اور کے حوالے نہیں کریں گے۔ مجھے دوران کلام تو نبیل انصاری صاحب کے خیالات میں شدت پسندی کا رنگ غالب دکھائی دیا لیکن جب میں اقصیٰ القدیم کے مقام پر پہنچا تو وہ ایک بہت بڑا راز تھا جو ہر مسلمانوں کی بڑی اکثریت کی نگاہوں سے کم علمی اور مغربی پروپیگنڈے کی وجہ سے اوجھل ہو گیا ہے۔ یہ راز آپ پر بھی آگے آنے والے حاتم کرد کی رفاقت میں اٹھائے گئے چند قدموں سے ظاہر ہو جائے گا۔ میں اپنے اس سفر کے اس موڑ کو بہت ہی اہم انکشاف سمجھتا ہوں۔

نبیل انصاری صاحب فرما رہے تھے، تمہیں کیا پتہ کہ تم سے مل کر میرا دل کتنا شادمان ہے۔ اھلاؤ سھلاؤ۔ آؤ تمہیں ایک ایسے فرد سے ملاؤں جو اقصیٰ اور صحرۃ کے بارے میں معلومات کا چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اس نے موبائل پر کسی سے بات کی اور ایک تنومند طویل قامت ادھیڑ عمر کا مرد چند ہی منٹ میں وہاں آن پہنچا۔

یہ حاتم کرد ہیں۔ نیبل انصاری نے تعارف کراتے ہوئے مجھے ان کے حوالے کر دیا اور خود کہیں چل دیے، لیکن اس وعدے کے ساتھ کہ شام کو ہم بعد نماز عشا کھانا ساتھ کھائیں گے۔ حاتم کرد کے اجداد شاید اپنے کرد سپہ سالار صلاح الدین ایوبی کے ساتھی تھے جو اس کے ساتھ صلیبی جنگوں میں فلسطین آئے تھے اور یہیں رچ بس گئے۔



حاتم نے پہلا وار میری غلط فہمی پر یہ کہہ کر کیا کہ یہ اصلی والی مسجد اقصی نہیں جہاں ہم کھڑے ہیں۔ مسجد اقصی وہ سامنے ہے۔ وہ بتا رہا تھا کہ یہ عمارت تو وہ ہے جو صلاح الدین ایوبی نے آٹھ سو سال پہلے بنائی تھی۔ اصلی اقصی اس کے نیچے والے تہہ خانے (basement) میں ہے۔ مجھے لگا کہ حاتم کرد کا اشارہ مسجد اقصی کے بارے میں اس قرانی حوالے سے تھا۔ اس انکشاف سے مجھے اپنے وجود میں ایک ولولہ تازہ کی لہر اڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ خیال آیا کہ حاتم کی رفاقت میں اب تقدیس و تاریخ کا ایک ایسا طلسم ہوش رہا میرے سامنے کھلے گا جس سے میرے ہم وطنوں کی ایک کثیر تعداد یقیناً لاعلم ہوگی۔



انہوں نے سرتا پامیر اخاموشی سے جائزہ لیا۔ حاتم نے جب میرا تعارف کرایا تو ایک نعرہٴ مرحبا فضا میں گونجا، ہم اب اقصی القدیم میں داخل ہو گئے۔ وہ بتانے لگا کہ کعبہ کی تعمیر چھ ہزار سال قبل حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بڑے صاحبزادے حضرت اسمعیلؑ کے ساتھ مل کر کی تھی۔ انہیں جب وہ حضرت ہاجرہ کے پاس چھوڑ کر مکے سے فلسطین واپس اپنی اہلیہ؛ حضرت سارہ اور بیٹے حضرت اسحاقؑ کے پاس لوٹے تو ایک مسجد حضرت ابراہیمؑ نے یہاں بھی بنائی۔ آپ نے یہ فریضہ اپنے چھوٹے بیٹے حضرت اسحاقؑ کے ساتھ مل کر کعبہ کی تعمیر کے ٹھیک چالیس سال بعد سرانجام دیا۔ ہم جہاں داخل ہو رہے ہیں یہی وہ مقام ہے۔ اس مسجد کا انتظام حضرت اسحاقؑ اور ان کی بعد کی نسلوں کے



پاس دو ہزار سال یعنی اس وقت تک رہا جب بنی اسرائیل فلسطین سے مصر ہجرت کر گئے۔ یہاں اسی رب کی عبادت ہوتی تھی جو حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور ہم سب کا رب ہے۔

سُبْحَنَ الَّذِيْ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا  
مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا  
الَّذِيْ بَرَكْنَا حَوْلَهٗ  
لِنُزِيْهِ مِنْ اٰيٰتِنَا  
اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيْرُ ①

پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے بندے کو راتوں رات  
مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک،  
وہ (مسجد اقصیٰ) کہ برکت دی ہے ہم نے جس کے ماحول کو  
تاکہ دکھائیں ہم اُسے اپنی کچھ نشانیاں،  
بے شک اللہ ہی ہے سب کچھ جاننے والا اور دیکھنے والا ①

سورۃ الاسرا (سورہ بنی اسرائیل) کی آیت نمبر ایک میں بیان کیا گیا ہے کہ - ”بہت اعلیٰ مرتبت ہے وہ ذات جو اپنے بندے (حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ) کو ایک ہی رات میں مسجد الحرام (مکہ المکرمہ میں کعبۃ اللہ) سے مسجد اقصیٰ لے گئی جس کے ارد گرد کے ماحول میں بڑی برکات ہیں تاکہ ہم انہیں (حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ) کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بے شک اللہ ہی سب کچھ جاننے اور سننے والا ہے۔“



آپ یہاں اس بات پر بہت خصوصی توجہ دیں کہ دونوں مقامات یعنی کعبہ اور اقصیٰ کے لیے قرآن ایک ہی لفظ ”مسجد“ استعمال کر رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ نبی کریم کی آمد سے پہلے بھی دو مقدس مساجد موجود تھیں یعنی کعبہ اور اقصیٰ جن کا اس آیت مبارکہ میں ذکر ہے۔

یہ نازک نکتہ جسے پروپیگنڈے نے بہت عیاری سے اپنی مکروہ چادر میں چھپا لیا ہے، آپ پر اس وقت بہت کھل کر واضح ہو جائے گا جب اقصیٰ القدیم کی تصویر اور بیاں آگے آئے گا۔ آپ پر یہ نکتہ او جھل بھی کھل کر عیاں ہو جائے گا کہ یہ علاقہ مسلمانوں کے لیے کیوں مقدس ہے؟ کیوں یہ مٹھی بھر نہتے عرب اتنی بڑی سازش کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے ہیں؟ بس آپ تین نکات سامنے رکھیں۔ پہلا یہ کہ مسجد الحرام کی طرح قرآن اقصیٰ کو بھی ایک مسجد ہی ظاہر کر رہا ہے۔ دوم یہ کہ مسجد الاقصیٰ کی تعمیر نبی کریم ﷺ کے زمانے سے پہلے کس نے کی اور سوئم یہ کہ اگر اس مقام کی دین میں کوئی اہمیت نہ ہوتی تو اللہ ہمارے نبی ﷺ کو مکہ المکرمہ سے براہ راست ہی آسمانوں میں معراج پر لے جاتا۔ اس مسجد اور اس کے اطراف کی برکات اور نشانیاں دکھانا لازم نہ ہوتا۔ وہاں ارد گرد کے ماحول میں بڑی برکات ہیں اور ان میں سے بھی چند نشانیوں کا انکشاف کوئی بہت بڑا راز اور مقام معرفت ہے، جب ہی تو آپ ﷺ کو مکہ سے بیت المقدس اس دور افتادہ مسجد کا سفر کرایا گیا۔ یہ سفر ایسا تھا کہ اسی صداقت کو جانچنے کے لیے اسی راستے پر جو مکہ سے یروشلم تک 755.1 میل طویل ہے۔ آپ کو مکہ سے آتے جاتے کئی قافلے مختلف مقامات پر دکھائی دیے تھے جن کے بارے میں مشرکین نے آپ سے سوال جواب کیے تھے جو بعد میں ان کی وطن واپسی پر بالکل درست نکلے۔ آپ کے اس بیان صادق نے آپ کی نبوت پر ایمان لانے والوں کے قلوب کو بڑی تقویت بخشی تھی۔

یہودی اور دیگر اسرائیل نواز استعماری قوتیں مسجد الاقصیٰ کو گرا کر اس کی جگہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر (دیکھئے تصویر) کا جواز یہ ڈھونڈتی ہیں کہ انجیل اور توریت میں یروشلم کا ذکر بشمول Zion 823 مرتبہ آیا ہے توریت یعنی Old Testament میں یہ ذکر 669 مرتبہ اور انجیل یعنی New Testament میں 154 مرتبہ جب کہ قرآن میں یروشلم کا ذکر ایک مرتبہ بھی نہیں۔ وہ حضرت ابراہیمؑ کی واپسی پر حضرت اسحاقؑ کے ساتھ مل کر ایک مسجد (اقصیٰ القدیم) تعمیر کرنے کا ذکر گول کر جاتے ہیں، جس کی جانب قرآن الحکیم کی مذکورہ بالا آیت کا اشارہ ہے۔ وہ اپنے نقطہ مخاصمت کا آغاز اور اختتام موجودہ مسجد (جو بالائی میدان میں واقع ہے) کی تعمیر کا الزام سیدنا حضرت عمرؓ اور صلاح الدین ایوبیؒ کو بطور غاصب فاتحین کی تعمیر کردہ عمارات کے طور پر دیتے ہیں۔ اسی لیے وہ اس کو مسمار کرنے کے درپے ہیں تاکہ اقصیٰ القدیم بھی ساتھ ہی برباد ہو جائے۔ مسلمانوں کے لیے اس حرم الشریف کی ایک ایک اینٹ مقدس ہے۔

میں اب دوبارہ حاتم کے بیان کی طرف لوٹتا ہوں وہ بتا رہا تھا کہ فرعون نے جب سرکشی پر کمر باندھ لی اور حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو اس کے مظالم سے نجات دلائی اور انہیں لے کر اس ارض مقدس واپس آگئے۔ یہ مقام ایک عرصے سے بے توجہی اور لاتعلقی کا شکار ہے۔ بنی اسرائیل کے بنیادی عقائد بھی بہت تبدیل ہوتے رہے۔ وہ بھی دیوار گریہ سے لپٹ کر روتے رہے تا وقتیکہ سیدنا عمرؓ نے فلسطین فتح کیا تو ان پر اس مقام مقدس کی حقیقت دوبارہ عیاں ہوئی۔ اندر داخل ہو کر ہمارا بیس قدم کے فاصلے پر ایک اور گارڈ سے واسطہ پڑا، اس نے بھی ہمارا استقبال مرہبا کہہ کر کیا۔ حاتم نے مجھے ایک مقام خصوصی کی جانب لے جانے کا اعلان کیا۔ ہم اب ایک ایسی پتھر کی بنی ہوئی زیر محراب راہداری میں کھڑے تھے جو بیس فٹ چوڑی اور پندرہ فٹ اونچی تھی۔ یہاں سرخ قالین بچھے ہوئے تھے۔ ہم دونوں ان پر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ایک ایسی دیوار کے پاس جا پہنچے جس کی تعمیر میں بڑے پتھر نمایاں تھے۔ یہاں نہ کوئی علامات تھیں نہ کوئی آرائشی طغرے۔ اس نے میرا جائزہ بہت احتیاط سے لیا کہ کیا میں کسی بڑی حقیقت کے انکشاف کے لیے تیار ہوں کہ نہیں۔ ”یہ وہ جگہ ہے جہاں ہمارے نبی ﷺ نے شب معراج کو انبیا کی نماز کی امامت کی تھی۔“ اس کا لہجہ بے حد دھیمہ اور الفاظ بہت ہی نپے تلے تھے گویا وہ میرے لیے اس راز سے آشنائی کے مراحل کو آسان قابل فہم اور قابل یقین بنا رہا ہو۔ مجھے لگا کہ میں ایک سکوت بھرے بے کراں خلا میں بے الفاظ وجود بن چکا ہوں۔

کچھ دیر بعد جب میرے حواس بحال ہونے لگے تو میرے تھر تھراتے لبوں سے صرف ایک لفظ بمشکل ادا ہو پایا ”یہاں؟“

میرے بازو تھام کر تقریباً گھسیٹتے ہوئے وہ مجھے ایک ایسے سجادے (جائے نماز) کے پاس لے گیا جہاں ہمارے نبی محترم ﷺ بطور امام کھڑے ہوئے تھے۔ تکبیر سیدنا ابراہیمؑ نے پڑھی تھی۔ پہلی صف میں سیدنا ابراہیمؑ، اسحاقؑ، اسمعیلؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، آدمؑ جیسے انبیا تھے، دیگر پچیس پیغمبر بھی پچھلی صفوں میں ان کے امامت میں تھے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ کل 124000 انبیا اور رسول ہیں یہ بات درست نہیں۔ یہاں برادر آپ بھی دو رکعت صلاۃ ادا کریں۔ یہ میری زندگی کی طویل ترین دور کعتیں تھیں۔ کئی مرتبہ بھولا، کئی دفعہ دوبارہ شروع کی۔ نماز کے اختتام پر میری ندامت کو حاتم نے بھانپ لیا اور کہنے لگا، میں یہاں کئی برسوں سے آرہا ہوں۔ اس مقام پر آج بھی مجھے انبیا کے ملبوسات اور ان کے وجود کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔

\*\*\*\*\*

## پارٹ: 7

تقدس اور خوش نصیبی کے ان جذبات نے کہ اللہ نے مجھے یہاں حاضری کی سعادت دی، میں حیرت و تقدیس کا مارا، احاطہ قبلہ اول میں، مغلوب کھڑا ہوں۔ حاتم کی باتیں ایک عجب عالم سرشاری میں مجھے سنائی دے رہی ہیں۔ یہ اقصی القدیم انبیا کی مسجد ہے یہاں حضرت خضر علیہ السلام بھی مغرب کی نماز پڑھنے آتے ہیں۔ وہ مجھے ارد گرد کا محل وقوع سمجھا رہا ہے۔ یہ حضرت ابراہیمؑ کا کنواں ہے۔ یہ محراب وہ ہے جہاں حضرت بی بی مریم ولادت مسیح سے پہلے عبادت فرماتی تھیں۔ جہاں حضرت زکریاؑ نے 80 برس کی عمر میں جب بیٹے کے دعا کی تو ان کے ہاں حضرت یحییٰؑ پیدا ہوئے تھے۔ یہاں کئی بے اولاد جوڑے عبادت کرنے آتے ہیں۔



مہراب ابراہیم





### مہراب ذکرِ یا

یہ محراب وہ ہے جسے کے سائے میں آپ اکثر نماز پڑھا کرتے تھے۔ یہ محراب وہ ہے جہاں حضرت بی بی مریم ولادت مسیح سے پہلے عبادت فرماتی تھیں، جہاں حضرت ذکرِ یا نے 80 برس کی عمر میں جب بیٹے کے دعا کی توان کے ہاں حضرت یحییٰ پیدا ہوئے تھے۔ یہاں کئی بے اولاد جوڑے عبادت کرنے آتے ہیں۔ بہت آہستگی سے میری رگیں اس تقدس کو اپنے آپ سے ہم آہنگ کرنے میں کامیاب ہوتی ہیں جو اس مقام عالی سے منسوب ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ میں دھیمے دھیمے اس تاثر کو اپنے اندر مزید سموں لوں مگر حاتم اس پر رضامند

نہیں۔ ہمیں یہاں سے جلد رخصت ہو جانا چاہیے، ہمیں کیا پتہ یہاں آنے والی اگلی ہستی کون ہے؟ اس کا لہجہ رازدارانہ اور انداز کچھ کچھ پراسرار سا ہے۔ ایسا جیسا کسی ایوان اقتدار سے جڑے اُن مقربین کا ہوتا ہے جو آنے جانے والوں کے مقام اثر و رسوخ کو سمجھتے تو ہوں مگر شرکت رازداری سے محروم ہوں۔



یہ وہ قید خانہ ہے جہاں کسی شیطان جن سے حضرت داؤد علیہ السلام نے کشتی کر کے اسے بچھاڑا تھا اور پھر ان میں اسے قید رکھا تھا میرے پاس اس کی بات ماننے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں۔ میں بو جھل قدموں اور الجھی ہوئی سانسوں سے کسی مریض قلب کی مانند سیڑھیاں چڑھتا ہوا اس کے پیچھے چل پڑتا ہوں۔ وہ صخرہ (وہ چٹان جہاں سے رسول اکرم ﷺ معراج پر تشریف لے گئے اور جس کے اوپر وہ مشہور سنہری گنبد موجود ہے جو جابجا تصاویر میں دکھائی دیتا ہے) کی جانب جانے سے پہلے احاطے کے مختلف مقامات کی جانب



مجھے لے جا رہا ہے۔ یہ جو ایک اکھاڑہ (amphitheatre) آپ دیکھ رہے ہیں جس کے ساتھ دو بڑے بڑے قدیم کمرے ہیں۔ یہ وہ قید خانہ ہے جہاں کسی شیطان جن سے حضرت داؤد علیہ السلام نے کشتی کر کے اسے پچھاڑا تھا اور پھر ان میں اسے قید رکھا تھا۔ یہ جن ایک لوک داستان کے بموجب تین دن بعد کسی گارڈ کو رشوت دے کر قید سے فرار ہو گیا۔ میرے پاس اس کی بات ماننے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں۔ میں بو جھل قدموں اور الجھی ہوئی سانسوں سے کسی مریض قلب کی مانند سیڑھیاں چڑھتا ہوا اس کے پیچھے چل پڑتا ہوں۔ وہ صخرہ (وہ چٹان جہاں سے رسول اکرم ﷺ معراج پر تشریف لے گئے اور جس کے اوپر وہ مشہور سنہری گنبد موجود ہے جو جابجا تصاویر میں دکھائی دیتا ہے) کی جانب جانے سے پہلے احاطے کے مختلف مقامات کی جانب مجھے لے جا رہا ہے۔ یہ جو ایک اکھاڑہ (amphitheatre) آپ دیکھ رہے ہیں جس کے ساتھ دو بڑے بڑے قدیم کمرے ہیں۔ یہ وہ قید خانہ ہے جہاں کسی شیطان جن سے حضرت داؤد علیہ السلام نے کشتی کر کے اسے پچھاڑا تھا اور پھر ان میں اسے قید رکھا تھا۔ یہ جن ایک لوک داستان کے بموجب تین دن بعد کسی گارڈ کو رشوت دے کر قید سے فرار ہو گیا۔



یہ وہ جگہ ہے جہاں حضرت سلیمانؑ کا انتقال ہوا

چلتے چلتے ہم ایک اور شکستہ گنبد کے نیچے آگئے۔ اس پر گھاس اُگی ہے اور بے ترتیب ٹھنیاں ادھر ادھر سے نکل آئی ہیں۔ یہاں حضرت سلیمانؑ کی نشست ہوتی تھی۔ یہیں ان کا انتقال ہوا تھا۔ یہیں وہ عصا تھامے کھڑے تھے کہ ان کے اس عصا کو دیمک کھا گئی اور وہ کھڑے کھڑے گر پڑے یہ منظر دیکھ کر وہ جن جو اس عمارت کی تعمیر میں مصروف تھے انہیں اندازہ ہو گیا کہ ان پر حکومت کرنے والے نبی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ وہ فرار ہو کر قریبی کوہ عزازیل پر پہنچ گئے۔

سیدنا سلیمانؑ سے پہلے جنوں اور انسانوں کے نبی جدا جدا ہوتے تھے۔ سیدنا سلیمانؑ سے ہمارے پیارے نبی ﷺ تک تمام مخلوق کے ایک ہی نبی رہے۔ اسی لئے ہمارے نبی ﷺ کو وہ مقام رفعت عطا ہوا کہ آپ کو رحمتہ اللعالمین کے شاندار لقب سے پکارا گیا۔ تمام جنوں کو ہدایات کا پیغام لینے کے لیے انسانوں کے نبیوں اور رسولوں کے اتباع کا حکم دیا گیا۔ میں نے جلدی سے پوچھ لیا کہ سیدنا سلیمانؑ کا مزار مبارک کون سا ہے؟

اس کا جواب کوئی وثوق سے نہیں دے سکتا۔ بہت سے لوگوں کا گمان ہے کہ ان کا مدفن اسی احاطے میں موجود ہے۔ میری اپنی برسوں کی تحقیق یہ بتاتی ہے کہ وہ اس احاطے میں مدفون ہیں جو مسجد الاقصیٰ اور مسجد براق کا درمیانی صحن ہے۔ اہل یہود البتہ مُصر ہیں کہ وہ حضرت داؤدؑ کے پہلو میں آرام فرما ہیں۔ مجھے لگا کہ حاتم کو واقعی ان ارد گرد کی عمارات اور دین سے متعلق بہت معلومات ہیں۔

یہ مسجد براق کہاں ہے؟ میرے سوال کے جواب میں وہ مجھے جلدی جلدی ایک طرف لے جانے لگا مگر ایک دم ایک چھوٹی سی رہائشی عمارت کے پاس رک گیا۔ آپ انہیں حجرے کہہ لیں۔ یہ شاید کسی زمانے میں ملازمین کے کوارٹر ہوں گے۔ یہ وہ چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں۔ جہاں امام غزالی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب احیائے العلوم تخلیق کی۔ یہ بے نشان کمرے، امام غزالی جیسا عالم بے مثال، احیائے العلوم جیسی مستند کتاب اور پھر وہی سورۃ الاسرا کی پہلی آیت، ہمارے نبی محترم محمد ﷺ کا مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ کا ساڑھے سات سو میل کا اس دور کا سفر جو ایک رات میں طے ہوا، انہیں اپنی چند نشانیاں دکھانا اور یہ بھی انکشاف کہ اس کے ارد گرد کے ماحول میں بڑی برکات ہیں۔ مجھے پختہ ایمان آ گیا کہ یقیناً یہ کوئی معمولی جگہ نہیں۔

ہم ایک مرتبہ پھر اقصیٰ کے صحن سے گزر کے ایک اور جانب بڑھ گئے۔ ایک بہت بڑے خالی احاطے کی جانب اس نے اشارہ کیا کہ یہود انہیں حضرت سلیمانؑ کا اصطبل کہتے ہیں۔ یہ سراسر لغو ہے۔ میرے اندازے کے مطابق حضرت سلیمانؑ یہیں کہیں مدفون ہیں۔ جب عید اور جمعہ کے دن نماز کے لیے مسجد اقصیٰ بھر جاتی ہے تو یہاں بھی نمازیوں کے لیے صفیں بچھا دی جاتی ہیں۔





یہ وہ مقام ہے جہاں براق کو باندھا گیا تھا  
یہاں سے آگے بڑھ کر دو سو میٹر بائیں جانب جا کر ہم ایک تنگ سے زینے کے پاس جا پہنچے۔ یہ زینہ بہت آہستگی سے مسجد براق کی  
جانب اتر جاتا ہے۔ ویسے تو اس مسجد کو بھی اقصی القدییم ہی میں شمار کیا جاتا ہے مگر عثمانی خلافت کے زمانے میں یہاں نہ جانے کیوں ایک  
دیوار کھینچ کر دونوں کو علیحدہ کر دیا گیا۔ یہ مسجد وہ مقام ہے جہاں آپ ﷺ نے اپنی سواری براق کو مکہ المکرمہ سے یروشلم آمد پر باندھا

تھا۔ وہ یہاں سے جب پچاس میٹر کے لگ بھگ آگے بڑھے تو 25 جلیل القدر انبیا کی ایک تعداد نے آپ کا استقبال کیا۔ ایک ایسا لوہے کا رنگ آج بھی یہاں دیوار میں نصب ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہی وہ کھونٹا ہے جس سے براق کو باندھا گیا تھا۔ مسجد کے دائیں ہاتھ والی اس دیوار کی عین پشت پر یہودیوں کی دیوار گریہ واقع ہے۔ میں نے یہاں دو رکعت نفل پڑھیں اور بہت خاموشی سے اس کھونٹے کے نیچے بیٹھ گیا۔ اتنی ساری تاریخ جو براہ راست میرے عقیدے اور میرے نبی محترم ﷺ کے حوالے سے مجھ تک اس قدر سرعت سے بڑھی چلی آرہی تھی اس کے بارے میں دھیمے دھیمے میں نے سوچنا شروع کیا۔ مجھے لگا کہ حاتم کو کم از کم یہاں سے باہر لے جانے کی کوئی عجلت نہیں۔ میرا اندازہ درست نکلا مجھ سے ایک مختصر سی اجازت لے کر وہ غائب ہو گیا۔ تیس منٹ بعد جب وہ لوٹا تو اس کے ساتھ ایک عمر رسیدہ عرب تھا۔ یہ عبدالرحمن ہیں، اس مسجد کے منتظم۔ ان کا حال ہی میں دل کا آپریشن ہوا ہے۔ ان کی طبیعت پچھلے چند دنوں سے ٹھیک نہیں۔ میں نے سوچا کہ آپ کی موجودگی کا بطور ہارٹ اسپیشلسٹ فائدہ اٹھالیں۔ میں نے بہت توجہ سے ان کا عارضہ سنا۔ مشکلات کا احوال جان کر انہیں کچھ مفید اور تسکین بخش مشورے دیے۔ ویسے تو اسے طبی اصطلاح میں placebo یعنی غیر طبی تسلی کہا جاتا ہے مگر اس کا مریض پر بہت خوشگوار اثر بھی ہوتا ہے۔ اکثر دل بھی پتنگ کی طرح ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ پتنگ بازی کی اصطلاح میں ہوا میں آجائیں تو خود بہ خود اڑنے لگتے ہیں۔ کچھ یہی معاملہ ہمارے بزرگ عبدالرحمن صاحب کا بھی ہوا۔ میرے تجویز کردہ placebo کے بعد چپکنے لہکنے لگے۔ فوراً ہی عربی کافی لینے دوڑ پڑے۔ کافی کی گرمابٹ اور خلوص کی خوشبو کے زیر اثر میں نے ایک ایسا باب الفت بلا سوچے سمجھے کھول دیا جو میرے مزاج اور پیشہ ورانہ تربیت سے بہت الگ اور ہٹ کر ہے۔

میں نے انہیں پیشکش کر دی کہ میں مزید سات دن یہاں ہوں۔ کسی مفت طبی مشورے یا معالجے کی ضرورت ہو تو مت ہچکچانا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کو بہ کو پھیل گئی بات مسیحائی کی۔ یوم رخصتی تک ہر دن بیس سے چالیس مریض مسجد الاقصیٰ میں دل و جگر تھامے میرے منتظر ہوتے تھے۔ میں انہیں مسجد الاقصیٰ کے باہر ایک چھوٹے سے کمرے میں مفت طبی مشورے دیتا تھا اور قیمتی دعائیں بطور معاوضہ مجھے ملا کرتی تھیں۔ یہ تشخیص، یہ معالجے، یہ مشورے، کہاں میں، کہاں یہ مقام، اللہ اللہ !! اب مڑ کر دیکھوں تو یہ مجھے اپنے طبی کیریئر کی معراج لگتے ہیں۔ ایسی پیشہ ورانہ تسکین اس سے پہلے مجھے کبھی محسوس نہیں ہوئی۔

عبدالرحمن کی کافی کے فوراً بعد جب ہم مسجد البراق سے باہر نکلے تو قبۃ الصخریٰ جگمگا رہا تھا۔ اس کی شاندار عمارت سے ایک غرور فاتحانہ عیاں تھا۔ مشہور مسلمان سیاح ابن بطوطہ بھی یہاں آیا تھا اس نے اس عمارت کے لیے 14 ویں صدی میں لکھا تھا، ”اس کا غیر معمولی حسن، اس کی چنگی، اس کا وقار اور اس کی تعمیر میں وحدانیت کا تاثر اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی اندرونی اور بیرونی سجاوٹ ناقابل بیاں ہے۔ اس کی تعمیر میں سونے کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔ جو بھی اسے دیکھتا ہے، مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ کبھی اس کے گرد بجلیاں کوندتی محسوس ہوئی ہیں تو کبھی یہ ایک بقعہ نور محسوس ہوتی ہے۔

\*\*\*\*\*





دائیں طرف ڈاکٹر کاشف مصطفیٰ اور بائیں طرف حاتم  
بات چل رہی تھی مشہور مسلمان سیاح ابن بطوطہ کی جو قبۃ الصخری کا حسن تعمیر دیکھ کر مبسوت رہ گیا تھا۔ حرم الشریف کی دیگر عمارات کی  
طرح قبۃ الصخری میں بھی صرف مسلمانوں ہی کو داخلے کی اجازت ہے۔ یہاں متعین کئی عرب محافظین مدرسے کے طالبان کی مانند  
موجود تھے۔ ان میں سے ایک بے حد وجہہ گارڈ لائن میرے آگے موجود ایک صاحب کے راستے میں حائل ہو گیا تھا۔ یہ حضرت چہرے

مہرے اور انداز سے مجھے کوئی ترک لگتے تھے۔ وہ ان سے چھٹا کلمہ سنانے کی فرمائش کر بیٹھا۔ اُس کا یہ مطالبہ سن کر میری ریڑھ کی ہڈی میں بھی ایک سرد برقی رود وڑ گئی۔ چھٹا کلمہ تو مجھے بھی یاد نہ تھا۔ فارسی زبان کا محاورہ ترکی بہ ترکی جو اردو میں بھی مستعمل ہے اب میری سمجھ میں آیا، کیوں کہ وہ ترک حضرت اس کے مطالبے پر جھنجھلا کر پوچھنے لگے کہ ”مسلمان ہونے کے لیے چھٹا کلمہ یاد ہونا اللہ نے کہاں لازم قرار دیا ہے؟“ اس کی جانب سے جو بھرپور وار ہوا، وہ بھی عربی تکبر کی ایک واضح علامت تھا۔ وہ کہنے لگا ”روز قیامت تمہارے مسلمان ہونے کا فیصلہ اللہ کرے گا مگر آج یہ اختیار مجھے حاصل ہے۔ ترک بے چارے کو دروازے سے ہی لوٹنا پڑا۔ حاتم کی رفاقت میں میرا اسلام کسی آزمائش اور اس کے احتیاط بھرے تکبر کی بھینٹ چڑھنے سے محفوظ رہا اور ہم اس مشہور عمارت میں داخل ہو گئے۔

بلاشبہ ابن بطوطہ نے جو کچھ تیرھویں صدی میں بیان کیا، وہ درست ہے۔ اس کا بیرونی حسن تو دلفریب ہے ہی، اندر کا حسن بھی ناقابل بیان ہے۔ دنیا میں اپنی اصل حالت میں موجود اس کی محراب آج اسلامی عمارات کی قدیم ترین محراب ہے۔ اس کے اندرونی حصے میں جابجا سنگ مرمر، دھاتی طغریے میں قرآنی آیات بیلوں کی صورت میں اس طرح درج ہیں کہ کہیں کہیں ان پر رنگ برنگے، پتھروں نے ان کا حسن خطاطی اور بھی بڑھا دیا۔ چونکہ وہاں ان دنوں مرمت کا کام جاری تھا لہذا چٹان (صخری) کو ایک دبیز کینوس سے ڈھانپ کر محفوظ کر دیا گیا تھا۔

مجھے یہ دیکھ کر کچھ مایوسی ہوئی تو حاتم میاں نے میرے چہرے کے تاثرات پڑھ لیے اور بہت آہستگی سے مجھے اپنے ساتھ آنے اور خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ایک کونے میں دنیا و مافیہ سے بے نیاز ایک بوڑھا عرب تلاوت قرآن پاک میں مشغول تھا۔ اس کے کان میں حاتم نے جھک کر کچھ کہا تو اس نے میرا بغور جائزہ لیا اور اثبات میں سر ہلادیا۔

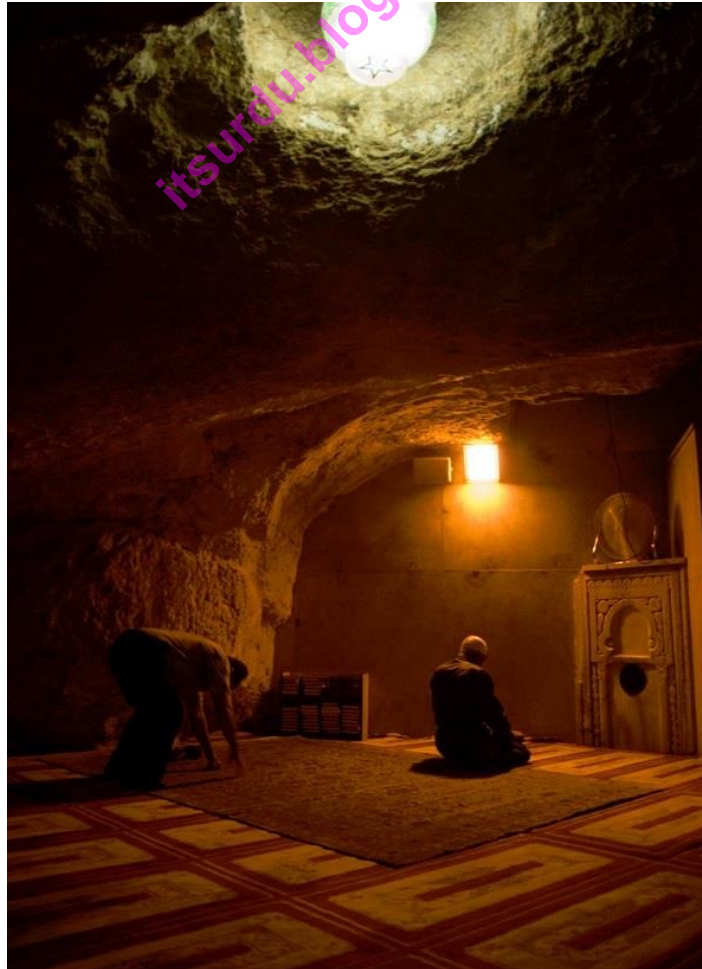
میں نے ارد گرد دیکھا تو مجھ سمیت کل دس زائرین ایک نیم دائرے کی شکل میں موجود تھے۔ وہ ان سب کو چھوڑ کر ہم دونوں کو اشارہ کرنے لگا اور ہم سمجھ گئے کہ وہ ہمیں خاموشی سے ایک دم سیدھے ہاتھ والے کونے میں جانے کا کہہ رہا ہے جہاں سے چند قدم ہی کے فاصلے پر ایک غار سا تھا۔ ”برُ الارواح“ (ارواح کا کنواں) حاتم نے میرے کان کے بہت پاس سرگوشی کی۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ کہاں تو میری زندگی مدتوں ایک ہی رفتار اور ایک ہی سمت میں ریٹکتی رہتی ہے اور کہاں اتنے قلیل وقت میں اللہ سبحانہ تعالیٰ مجھے اتنا کچھ دکھا رہا ہے کہ میں ارواح کے کنوئیں میں اتر رہا ہوں۔ آپ کو اگر ایک مشہور فلم سیریز انڈیانا جونز کی ایک فلم ”lost arc Raiders of the“

دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو تو (جس کے ڈائریکٹر بھی یہودی ہیں یعنی Steven Spielberg) آپ کے علم میں ہوگا کہ یہودیوں کا مشہور Arc of Covenant ”تابوت سیکنہ“ یعنی لکڑی کا وہ مقدس صندوق جس میں ان کے عقیدے کے مطابق وہ دو تختیاں، جو کوہ



طور پر حضرت موسیٰ کو اللہ نے عطا کیں۔ حضرت ہارون کا عصا، وہ برتن جس میں ان پر آسمان سے بھیجا جانے والا من و سلوی محفوظ ہے۔ اس صندوق کو ایک بیانیے کے مطابق، بابل کی افواج 587 قبل از مسیح اپنے حملے میں ہیکل سلیمانی کو برباد کر کے ساتھ لے گئی تھیں۔ کچھ یہودی البتہ بعد میں یہ کہنے لگے کہ اسے حملہ آوروں سے محفوظ رکھنے کے لیے عین اسی جگہ چھپا دیا گیا تھا جہاں ہیکل سلیمانی موجود تھا۔

مذکورہ بالا فلم میں تو انڈیانا جونز کو یہ تابوت برالارواح میں مل جاتا ہے۔ فلم میں البتہ ایک مصلحت دور دراز کے تحت اور اسکی جانب غیر ضروری توجہ مبذول ہونے سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کی برآمدگی اور کنوئیں کا محل وقوع مصر کے قدیم شہر صان الحجر (جنات) جس کا قدیمی نام تانس تھا وہاں سے دکھائی گئی۔ یہودیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ روز قیامت سب ارواح قبۃ الصخری والے اسی کنوئیں میں جمع کی جائیں گی۔ ان کے ایک اہم بزرگ یہ کہتے ہیں کہ اس کنوئیں سے ان روحوں کی آوازوں میں جنت کے دریاؤں کی لہروں کی گنگناہٹ سنائی دیتی ہے۔ ہم اس کنوئیں میں داخل ہو گئے۔ یہ ایک کنواں ایک طرح کا غار ہے اس کے فرش کے اوپر ایک ساڑھے چھ فٹ کی انتہائی چکنی چٹان بطور ایک پلیٹ فارم کے موجود ہے۔ جس کی اونچائی ساڑھے چھ فٹ اور چوڑائی اور لمبائی تقریباً 14 فٹ ہے۔ اس کے فرش پر سجادے (جانمازیں) موجود ہیں اور ان جانمازوں کے درمیان ایک بہت صاف دائرہ نما سوراخ موجود ہے۔ گویا یہ ایک طرح کا ایسا ٹیک آف اسٹیشن ہے جہاں سے کسی خصوصی سواری نے روانہ ہونا ہو۔



یہی عین وہ مقام ہے جہاں سے ہمارے نبی محترم ﷺ معراج کے لیے بلندیوں پر گئے تھے

اس کمرے نما کنوئیں میں داخل ہوتے ہی حاتم کی آنکھیں ایک سرور بے پایاں سے سرخ ہو گئیں۔ نیچے آن کر لگا کہ حاتم نے مجھے موقع دیا کہ میں سیڑھیاں اتر کر عین اس سوراخ کے نیچے فرش پر کھڑا ہوں۔ اس نے اپنے لیے عین مقابل سیڑھیاں منتخب کیں۔ یہی عین وہ مقام ہے جہاں سے ہمارے نبی محترم ﷺ معراج کے لیے بلندیوں پر گئے تھے۔ وقت میں سفر کرنا ایک بے حد دل چسپ موضوع ہے۔ مجھے یہ اس سوراخ کے نیچے کھڑے ہو کر باہر آسمانوں میں جھانکتے ہوئے پہلی دفعہ سمجھ آیا ایسا لگا کہ اس سنہری گنبد کی چھت سے آر پار گزر کر نبی کریم ﷺ کے عام سے ایک امتی ہونے کے ناطے، سعادت حضوری کے انعام کے طور پر ہزار ہا شمع الانوار مجھ پر برس رہی ہیں۔ یہ وہ کیفیات ہیں جن کا بیان بہت ہی مشکل ہے۔ مجھے اس کے نیچے اور منڈیر کو چھو کر لگا کہ میری روح میں برکات اور ادراک کا ایک نیا باب وا ہو گیا ہے۔ مجھے پہلی دفعہ زمان و مکان کی وہ گتھی بھی سلجھتی ہوئی محسوس ہوئی جو متعلق فلکی طبعیات اور خود فلکیات اور علوم ریاضی کی الجھن بنی ہوئی ہے۔ مجھے وقت اور فاصلوں کے وہ حوالے جو دنیا میں رائج ہیں، اللہ کے نزدیک بے معنی دکھائی دیے۔ وہ جو مالک کن فیکون ہے۔ اس سفر کے حوالے سے اس مقام پر میرے ایمان کو مغرب کے کھرے سچے سائنسدانوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی ایسا استحکام ملا کہ میرے پاس اب نبی کی اطاعت اور اللہ کی بندگی کا جواز خالصتاً اسلامی ہے۔

میں یہاں گہری مدہوشی کے عالم میں تھا کہ حاتم نے میرے شانے جھنجھوڑتے ہوئے مجھے دو رکعت نفل صلوٰۃ کی تجویز دی۔ مجھ میں ہمت نہ تھی کہ میں اس پر عمل کرتا۔ میرے لیے یہ بیان ناممکن ہے کہ میں آپ کو بتا سکوں کہ اس کنوئیں میں میری کیا کیفیت تھی۔ میں نے انکار کر دیا تو مجھے لگا کہ شاید وہ مجھ سے پہلے کسی اور کے ساتھ اسی طرح کے معاملات میں شامل رہا ہے۔ مجھے وہ کہنے لگا وقت بہت کم ہے۔ میں اپنی کیفیت کی وجہ سے اس سے لا تعلق ہو چلا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا تمہارا قد اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ تم اس پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر منڈیر کو چھو لو۔

میں نے اس کا کہنا مانا اور اپنا دایاں ہاتھ اس کنوئیں کی منڈیر کو چھونے کے لیے اٹھایا تو یہ ہاتھ جو بے حد نازک سرجری میں بھی کبھی نہیں کپکپایا، ایک کمزور سے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ یہ عالم ان ٹانگوں اور گھٹنوں کا تھا جو دوران آپریشن جانے کتنے گھٹنے بلا تکان مجھے سنبھالے رکھتے ہیں۔ میں نے منڈیر کو چھوا اور فوراً ہی بیٹھ کر دو رکعت نماز کی نیت باندھ لی اپنے پیاروں کے لیے جو دعائیں میں نے مانگنی تھیں، یک لخت ذہن سے محو ہو گئیں۔ میں نے اپنی صلوٰۃ ختم کی اور حاتم کے ساتھ اوپر چلا آیا۔ وہاں اب کوئی اور زائر موجود نہ تھا۔ حاتم نے یہ کرم کیا کہ ان بزرگ قاری کے ساتھ مل کر اس کینوس کو ہٹا دیا تاکہ میں صخری یعنی اس چٹان کی ایک جھلک دیکھ پاؤں جہاں سے آپ معراج پر تشریف لے گئے تھے۔ یہ 60 فٹ لمبی 40 چوڑی اور 6.5 فٹ اونچی چٹان ہے۔



حضرت جبریلؑ کے دست امین کا نشان

عرب قاری صاحب بتانے لگے کہ ہمارے رسول اکرم ﷺ براق پر سوار ہوئے تو چٹان و فور جزبات اور جزبہ وار فنگی سے براق کی رفاقت میں بلند ہونے لگی تو حضرت جبریلؑ نے حکم الہی سے اس پر اپنی ہتھیلی رکھ کر اسے لوٹا دیا تو آپ کے دست امین کا نشان موجود رہ گیا۔ (دونوں تصاویر یہ فرق واضح کرتی ہیں)۔ آپ یہ بھی بات جان لیں کہ صخریٰ کا جو زیریں فرش ہے، وہ بُر الارواح کی چھت ہے اور بُر الارواح کا جو کناں ہے اس کی نشانی آپ کو اس سوراخ سے دکھائی دیتی ہے جو بُر الارواح سے صخریٰ کے بالائی فرش تک موجود ہے جو تصویر میں آپ کی آسانی کے لیے ایک پیلے اسکوائر سے ظاہر کیا گیا ہے۔ یہاں براق کے سموں کے نشان بھی ہیں۔

میں تیزی سے کچھ تصویریں اپنے کیمرے سے بنانے میں لگ گیا۔ اتنے میں اوپر کچھ آوازیں سنائی دیں تو انہوں نے جلدی سے کینوس کو چٹان پر پھیلادیا۔ میں بھی خاموشی سے ایک کونے میں الگ تھلگ انجان بن کر بیٹھ گیا۔ یہ مقام یعنی قبۃ الصخری اہل یہود کے ہاں بھی بہت متبرک گردانا جاتا ہے وہ اسے ماؤنٹ موریہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ اسے دنیا کا نقطہ آغاز سمجھتے ہیں۔ یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ اسی چٹان پر حضرت اسحاقؑ کے نسلی تفاخر کی بنیاد پر قربانی پیش کی گئی تھی۔ ان دنوں اسرائیل میں ان کے مذہبی پیشواؤں کا ایک طبقہ ایسا ہے جو اس جگہ کو بزور طاقت مسلمانوں سے چھین لینے کے مطالبے اور حیلے کر رہا ہے۔

اس دوران مغرب کی اذان ہو گئی اور صلوٰۃ کی ادائی کے بعد مجھے ایک دفعہ پھر عبدالرحمن صاحب نے گھیر لیا مگر اب کی دفعہ وہ تنہا نہ تھے بلکہ بیس عدد مریض بھی ان کے جلو میں تھے اور میری مدد کے لیے انہوں نے کہیں سے ایک طالب علم کو بھی معاونت

کے لیے شریک معالجہ کر لیا تھا کہ وہ میری ترجمانی کے فرائض انجام دیں گے۔ بسم اللہ، اس مقام عزت پر مجھے ان سب مریضوں کی آنکھوں میں بہت سی امیدیں دکھائی دیں۔

طبی معائنے کا یہ سلسلہ عشا کی نماز تک جاری رہا۔ میں نے عشا وہیں مسجد اقصیٰ میں پڑھی اور باب الرحمہ کی جانب چل پڑا۔ حاتم کہیں جا چکا تھا۔ راستے میں کئی خاندان دکھائی دیے جو مصروف الطعام تھے، مجھے کم از کم پانچ ایسے خاندان یاد ہیں جو بہت مصر تھے کہ میں ان کے ساتھ شریک طعام ہو جاؤں۔ باب الرحمہ کہ پاس پہنچ کر مجھے لگا کہ میں ملاقات کے لیے طے شدہ، حاتم کی بتائی ہوئی جگہ بھول چکا ہوں۔ ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ پیچھے سے مجھے کسی نے ڈاکٹر مصطفیٰ کہہ کر آواز دی۔ مڑ کر دیکھا تو ایام گزشتہ کی بھٹکی ہوئی روح شائم ایمنون دکھائی دیا۔ شائم ایمنون تو آپ کو یاد ہے نا۔ ارے وہی ایتھوپین ربی، جو جہاز میں میرا ہم نشین تھا۔

”مجھے یقین تھا ہماری ملاقات ایک مرتبہ اور ہوگی“ میں نے ٹکٹا اُس سے دیوار گریہ کا پوچھا کہ کیا وہاں گیا تھا تو جواب میں اس نے بھی میرے معمولات جاننا چاہے میں نے تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے صرف اقصیٰ اور قبۃ الصخریٰ کا ذکر کیا۔ اس پر وہ کسی توقف کے بغیر گویا ہوا ”اچھا تو تم بھی ان لوگوں میں سے ہو جو یہ مانتے ہیں کہ تمہارے نبی وہیں سے آسمانوں کی جانب گئے تھے؟ میں نے سوال کی تحقیر بھری کاٹ محسوس کی اور مجھے لگا کہ اس قدر روشن خیال ہونے کے باوجود بھی وہ اندر سے اپنے مذہب سے ویسے ہی جڑا ہے جیسے دیگر صیہونی باہر سے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے سوال کی مزید وضاحت اس نے قبۃ الصخریٰ کی جانب اشارہ کر کے کی اور میرے مختصر سے جواب اثبات کو سن کر کہنے لگا۔ ”جان لو کہ دنیا کا مرکز اسرائیل ہے، اسرائیل کا مرکز یروشلم، یروشلم کا اپنا مرکز ٹمپل آف ماؤنٹ یعنی حرم الشریف ہے، جس کا اپنا مرکزی مقام یہ صخرہ ہے یعنی ہمارا ماؤنٹ موریا۔ یہ چٹان ایسی ہے کہ ہمارا بھی پختہ یقین ہے کہ یہ دنیا اور ماروائے دنیا کے درمیان ایک رابطہ ہے اور اس کا مرکز ایک سوراخ ہے جہاں سے تم کہتے ہو کہ تمہارے نبی آسمانوں کی معراج پر تشریف لے گئے تھے۔“

اس سے پہلے کہ میں اس کے جملے کی گہرائی کو سمجھ پاتا، وہ مجھ سے دعا کی درخواست کرتا ہوا تیزی سے اندھیرے میں کسی بھوت کی مانند کہیں غائب ہو گیا۔ کچھ ہی دیر میں میرا نیا نائب و سیم جو مریضوں کے معائنے میں میرا معاون تھا میرے پاس بھاگتا ہوا آیا اور بتانے لگا کہ نبیل انصاری آپ کا رات کے کھانے پر انتظار کر رہے ہیں۔

\*\*\*\*\*





نبیل انصاری صاحب کا گھر چھوٹا اور دل بہت بڑا تھا۔ یہ بات میں بطور معالج نہیں کہہ رہا، محاورہ تاعرض کر رہا ہوں۔ اس چھوٹے سے لاؤنج میں چار افراد شریک طعام تھے، خاکسار، میزبان، شیخ نائف اور حاتم کرد۔ ہماری نشست فرش پر تھی۔ رسیلے بکری کے گوشت کا منصف بنایا گیا تھا۔ یہ عربی ڈش ایک خاص قسم کے خمیری دہی ”جمید“ میں رپنے (Marinate) کے لیے بالکل اس طرح چھوڑ دی جاتی ہے جیسے ہمارے ہیں بچھیا کا گوشت بریانی کے مصالحوں میں دہی لگا کر چار پانچ گھنٹے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ گوشت بعد میں زعفران چھڑ کے ہوئے چاولوں پر پھیلا دیا جاتا ہے۔ آپ چاہیں تو ان سفید چاولوں پر تلے ہوئے بادام، کشمش، چلغوزے یا کاجو بھی ڈال سکتے ہیں۔



شیخ نائف کی دو بڑی شناختیں ہیں ایک تو وہ سماجی لحاظ سے برادری کے بڑوں میں شمار ہوتے ہیں دوسرے وہ سلسلہ شطاریہ کے شیخ بھی ہیں۔ اہل سلوک کا شطاریہ سلسلہ کا آغاز ایران میں پندرہویں صدی میں ہوا۔ اس کی بنیاد شیخ سراج الدین عبداللہ شطاری نے رکھی تھی۔ اسے ہندوستان میں ایک باقاعدہ صوفی سلسلے کا روپ دیا گیا اور پھر اس کے ماننے والے اسے حجاز اور اندونیشیا تک لے گئے۔ شطاریہ بمعنی برق رفتار۔ اس میں سلوک کی منازل بہت تیزی سے طے کرائی جاتیں ہیں۔ صوفیوں کا یہ وہ واحد سلسلہ ہے جو راہ سلوک میں فنا کو نہیں مانتا۔ علم جو اللہ کا بقا کی مانند ایک وصف عظیم ہے اس میں آگے بڑھتے رہنے کا مقصد قرب الہی ہے۔ اس پر مزید گفتگو پھر کبھی۔



ان کے علم میں جب یہ بات لائی گئی کہ ایک پاکستانی مسلمان، اسرائیل اور بالخصوص بیت المقدس میں بطور سیاح تنہا آن پہنچا ہے تو وہ مجھ سے ملنے اس دعوت میں خصوصی طور پر شریک ہوئے۔ ان کی عمر اسی برس کے لگ بھگ ہے لیکن آنکھوں کی چمک اور دماغ کی پھرتی جوانوں کو مات کرنے والی ہے۔ انگریزی بولتے ہیں تو لگتا ہے کہ عربی کبھی بولی ہی نہیں، بے داغ اور طرح دار۔ لب و لہجہ بے حد مہذب اور الفاظ کا انتخاب نپا تلا اور من بھاتا۔ بعد از طعام جب عربی چائے کا دور برپا ہوا تو نبیل انصاری صاحب گویا ہوئے کہ میرے بھائی مصطفیٰ ہم جانتے ہیں کہ بطور مسلمان اور پاکستانی آپ کے ذہن میں ہمارے بارے میں ہماری جدوجہد کے بارے میں اور ہماری مشکلات کے بارے میں بہت سے سوال ہوں گے لہذا میں نے مناسب جانا کہ شیخ نائف سے آپ کی ملاقات کا اہتمام کیا جائے کیوں اس وقت ہمارے درمیاں ان سے بہتر آپ کو جوابات دینے والا کوئی اور نہیں۔ میں نے جب شیخ نائف کی جانب دیکھا تو ان کی مسکراہٹ میں شفقت، اعتماد اور ایک شدید احساس وابستگی واضح طور پر جھلملارہا تھا۔

میں نے اپنا گلا اور ذہن دونوں ہی سوالات پوچھنے کے لیے بہ یک وقت صاف کیے۔ شیخ نائف نے میرا تذبذب جلد ہی بھانپ لیا اور اپنی جانب سے یہ فراخ دلانہ پیش کش کی ”ہم سب تاریخ کے طالب علم ہیں لہذا سوال پوچھتے وقت کسی الجھن کا خیال مت کرنا۔“

ے شمار مسلمان یہ جان ہی نہیں پاتے کہ سنہری گنبد سے دور ہٹ کر چپ چاپ کھڑی یہ سفید پلاسٹر والی اداس سی ایک منزلہ عمارت ہی دراصل ان کا قبلہ اول ہے

سوالات اور شبہات سے کلبلاتی ایک خلش جو مجھے تل ایب میں اپنی دوست ڈاکٹر کلوری کے شوہر ڈیوڈ سے گفتگو کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ آپ کو یاد ہے ناکہ ڈیوڈ نے مجھے ان کے مسیحا کی آمد، ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے لیے جنگ عظیم اور ان کے کیلنڈر کے حساب سے اس کی آمد میں محض 224 سال کا باقی ماندہ وقفہ کا تذکرہ کیا تھا سو اس بارے میں دوسری طرف کے متعلقین کی رائے جاننے کے لیے قدرے اختصار سے بتایا۔ ان کے ہاشمی چہرے پر ایک پراسرار سی مسکراہٹ میں حالات اور تجربہ کا ٹھہراؤ اور گہرائی نمایاں تھی، پھیل گئی۔

”کبھی تم نے یہ سوچا،“ شیخ نائف گویا ہوئے کہ یہودی عین اس مقام پر جہاں ہماری مسجد اقصیٰ واقع ہے، وہاں پر اپنا ہیکل سلیمانی یعنی Temple of Zion تعمیر کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں۔؟“ میرے لیے اس سوال کی رفتار اور کاٹ کو سمجھنا چونکہ ممکن نہ تھا لہذا میں نے خاموشی کو بہتر جواب جانا۔ اللہ کی عبادت میرے مصطفیٰ بھائی مسجد، چرچ، مندروں اور کنسیاؤں یعنی synagogues میں ہوتی ہے۔ یہودی اگر ہم سے یہ کہیں کہ ہم یہاں ایک چھوٹا سا synagogue بنانا چاہتے ہیں تو ہم ان سے کوئی مناسب جگہ کی بات کرنے میں کوئی عار محسوس نہ کریں۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں دنیا بھر میں مختلف مذاہب کی عبادت گاہیں ایک دوسرے کے پڑوس میں اور ساتھ ساتھ ہوتی ہیں۔ ہمارے گھر ساتھ ساتھ ہیں تو ہماری عبادت گاہ کا ایک دوسرے کے پڑوس میں ہونا عین رواداری ہے۔

مجھے یقین ہو گیا کہ شیخ نائف مجھے بہت آہستگی سے اسلامی تاریخ کے ایسے موڑ پر لے جا رہے ہیں جس کا بہت کم مسلمانوں کو موجودہ سیاسی تناظر میں اور مغربی پروپیگنڈے کے غلبے کی وجہ سے درست ادراک ہے۔

شیخ نائف فرمانے لگے کہ ”ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی پشت پر اقصیٰ القدیم اور جدید کی بربادی اور ایک خفیہ خزانے کی تلاش ہے۔“

”خزانہ اور مسجد کے نیچے؟“



<p>اور جب آیا ان کے پاس کوئی رسول اللہ کی طرف سے تصدیق کرتا ہوا اسکی جوانی کے پاس ہے تو پھینک دیا ایک فریق نے ان لوگوں میں سے جنہیں دی گئی تھی کتاب۔ کتاب اللہ کو پیچھے اپنی پیٹھوں کے۔ گویا وہ نہیں جانتے۔</p>	<p>وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٠١﴾</p>
<p>اور پیروی کی انہوں نے اس کی جو پڑھا کرتے تھے شیاطین سلطنت میں سلیمان کی۔ حالانکہ نہیں کفر کیا سلیمان نے بلکہ شیاطین ہی کفر کرتے تھے۔ سکھاتے تھے لوگوں کو جادو۔ اور وہ جو نازل کیا گیا تھا دو فرشتوں پر۔ بابل میں ہاروت اور ماروت پر۔ اور نہیں سکھاتے تھے وہ دونوں کسی کو جب تک نہ کہہ دیتے تھے درحقیقت ہم میں آزمائش تو نہ تم کفر کرنا۔ تو وہ سکھا کرتے تھے ان دونوں سے وہ کہ جدائی ڈالیں چمکے ذریعہ سے درمیان میں مرد اور اسکی بیوی کے۔ اور نہیں وہ پہنچا سکتے تھے نقصان اس سے کسی کو مگر اذن سے اللہ کے۔ اور وہ سیکھتے تھے وہ کچھ جو نقصان ہی</p>	<p>وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيْطَانُ عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَٰكِنَّ الشَّيْطَانُ كَفَرُوا يَعْلَمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ وَ مَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ وَمَا يُعَلِّمَنِ مِنْ أَحَدٍ حَتَّى يَقُولَا إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهِ وَ مَا هُمْ بِضَآئِرِينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَ يَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَ</p>

حضرت سلیمان کے وقت میں یہاں سے بابل اور نینوا تک اس علاقے میں جادو کالے اور فتنہ پرور خفیہ علوم کو بڑا فروغ ہو چکا تھا۔ یاد آیا کہ اس کا ذکر قرآن الکریم میں سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 102 میں اللہ سبحانہ تعالیٰ نے بڑی صراحت سے کیا ہے کہ سلطنت سلیمان میں شیاطین کے پیروکار ان کے کفر کی پیروی میں لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ ان پر اتمام حجت کے لیے دو فرشتے ہاروت اور ماروت کو جادو سکھا کر بھیجا گیا تھا تاکہ وہ لوگوں کی آزمائش ایک بڑی وارنگ سے کریں کہ یہ جادو تو سر اسر کفر ہے۔ اس سے وہ میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈال سکتے تھے۔ اس علم کے چاہنے والوں کا آخرت میں بجز نقصان کے کوئی حصہ نہیں۔ آپ چونکہ اللہ کے نبی تھے لہذا آپ کو حکم دیا کہ وہ اس علاقے میں ایک آپریشن کلین اپ کر کے ایسے تمام قدیم علوم کے خفیہ صحیفے اور ان کی معاونت میں استعمال ہونے والی اشیا کو اپنے قبضے میں لے لیں اور اس کام میں مہارت رکھنے والے جادوگر، عامل، ٹونہ باز، جو تشی ان سب کو پہلے توبہ کا موقع دیا گیا اور جس



نے اللہ کا حکم نہ مانا اور نبی سے بغاوت کی ان کو کڑی سزائیں دی گئیں۔ آپ یعنی حضرت سلیمانؑ نے یہ تمام اشیاء بشمول ان خفیہ صحیفوں کے ایک جگہ اپنے محل میں دفنادیے۔

کئی محققین کا خیال ہے کہ ان نانٹس کے ہاتھ کچھ ایسے صحیفے آگئے تھے جن میں درج منتر دولت پر قابض جنوں اور دیگر مخلوقات کو اپنا مطیع بنالیتے تھے۔ یہی وہ نانٹس تھے جنہوں نے تاریخ انسانی کا پہلا بینک قائم کیا

ان کی اس وضاحت سے میرے دماغ کی دھند ایسے چھٹنے لگی جیسے رات کی تاریکی آہستگی سے پھیلتی کرنوں سے پہلے پہل پہاڑ کی بلند و بالا چوٹیوں پر ہوتی ہے۔ مجھے پر یہ راز عیاں ہونے لگا کہ وہ ان خفیہ کتب اور دستاویزات تک رسائی کے متلاشی ہیں۔ چونکہ ڈیوڈ کے بیانیے میں، میں نے ایتھوپین ربائی شائے آمون کا بھی تذکرہ کر دیا تھا لہذا جواب میں شیخ ناف کو اس کا حوالہ دینے میں کوئی دشواری نہ ہوئی وہ کہنے لگے کہ تمہارا وہ مسافر ساتھی ٹھیک کہہ رہا تھا، یہ ساری شرارت یہودیوں میں شامل ان صہیونی طاقت ور گروپوں کی ہے جو ہر حال میں دنیا پر قابض رہنا چاہتے ہیں۔“

اب سوال کرنے کی باری میری تھی۔ ”لیکن یہ صہیونی بھی اپنے مذہبی جھکاؤ کے حساب سے تو بالآخر یہودی ہیں؟“

ہر سیاسی تحریک کو ایک بہت بڑی جذباتی بیٹری اور روحانی چارجر کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ عوام کی اکثریت کو مذہب کے نام پر اس سے جوڑ کر رکھا جاسکے۔ بڑی سیاسی تحریکوں میں اگر مذہب سے جذباتی لگاؤ جوڑ کر نہ رکھا جائے تو وہ بہت جلد کمزور پڑ کر اپنی اہمیت کھو بیٹھتی ہیں اس کا بڑا ثبوت آپ کو نازیوں کے ہاں ملتا ہے۔ انہوں نے مذہب کی ایک کمزور اور مسخ شدہ شناخت آریائی نسلی برتری کو اپنے حامیوں کے گلے میں باندھ دیا تھا۔ خود تمہارے اپنے جنوبی افریقہ میں بائبل کے اٹلے سیدھے حوالوں سے سفید فام نسلی امتیاز (Apartheid) کو مسلط کرنے کی کوشش کی گئی۔ صہیونیت بھی اپنے اقتدار اور کنٹرول کے ایجنڈا کے نفاذ اور اپنے عزائم کو فروغ دینے کے لیے یہودی مذہب کا سہارا لیتی ہے۔ وہ کچھ دیر کے لیے اپنے کپ میں چائے بھرنے کے لیے رک گئے۔

اب میری باری تھی کہ میں خود کو ہنری کسنجر اور بان کی مون کا ہم پلہ سفارت کار ثابت کروں۔ لہذا میں نے صدیوں کی اس مختصرت کو وہاں بیٹھے بیٹھے ہی ختم کرنے کے لیے پوچھ لیا کہ ”کیا ان کی جانب سے اس حوالے سے کبھی گفت و شنید کا بھی معاملہ آیا؟“

جی ہاں۔ کئی دفعہ لیکن ہم انہیں بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ ان کا محض دکھاوا ہے کہ دنیا کو وہ ایک پرامن قوم کے طور پر اپنا چہرہ دکھاسکیں۔ ایک صلح جو قوم کا روپ جو اپنے تمام مسائل کا حل باہمی گفتگو کے ذریعے کرنا چاہتی ہے۔ دنیا کے مسلمانوں کی اکثریت کو

چونکہ ان مقامات کی زیارت کے لیے اسرائیل آنے پر پابندی ہے، لہذا وہ اپنے نشریاتی اداروں بالخصوص الیکٹرانک میڈیا اخبارات اور رسائل جن کی اکثریت غیر مسلموں کی ملکیت ہے ان پر بہت عیاری سے Dome of the Rock (قبتہ الصخری) کو بطور مسجد الاقصیٰ پیش کرتی ہے۔

یہاں انہوں نے توقف کر کے بغور میرا جائزہ لیا کہ کیا مجھ پر ان کی باتوں کا کچھ اثر بھی ہو رہا ہے یا محض میں میزبان کی بے گار سمجھ کر ٹال رہا ہوں۔ مجھے لگا کہ وہ اپنے بیان میں بالکل صادق ہیں کیوں کہ یہاں آمد سے بہت پہلے تک مجھ پر بھی مسجد الاقصیٰ کا اور قبتہ الصخریٰ کا فرق کچھ ایسا خاص واضح نہ تھا۔ جب کہ میں اپنے آپ کو بہت حد تک باخبر افراد میں شامل کرتا ہوں۔

اس میں کچھ قصور تو اقصیٰ کی اپنی سادگی کا بھی ہے جو دور سے کھینچی گئی تصاویر بالخصوص ان تصاویر میں جو بلندی سے لی گئی ہوں قبتہ الصخریٰ کے تعمیراتی حسن جہاں تاب کی منظر کشی میں شناخت سے محروم ہو کر رہ جاتی ہے۔ بے شمار مسلمان یہ جان ہی نہیں پاتے کہ سنہری گنبد سے دور ہٹ کر چپ چاپ کھڑی یہ سفید پلاسٹر والی اداس سی ایک منزلہ عمارت ہی دراصل ان کا قبلہ اول ہے۔ مکہ المکرمہ اور مدینۃ المنورہ کے بعد تیسرا اہم ترین مقدس مقام، ان کی مسجد الانبیاء یعنی مسجد الاقصیٰ ہے۔ مجھے لگا کہ شیخ نائف سے میری گفتگو کچھ بوجھل ہو چلی ہے لہذا میں نے ذہن میں بہت دیر سے مجتے ہوئے ایک سوال کو آہستگی سے باہر کھینچ نکالا۔

”یہ علوم مخفی اور جادو ٹونوں اور عملیات کے جن صحیفوں کا آپ نے ابھی تذکرہ فرمایا تھا ان میں سے کچھ اب تک کسی بے قرار کھوجی روح کو کسی کھدائی یا اتفاقاً کہیں پڑے ہوئے ملے بھی ہیں؟“

ممکن ہے صلیبی جنگوں میں عیسائی افواج میں ایک ایسا فوجی دستہ (Legion) تھا جو خود کو Order of the Poor Knights of Christ کہتا تھا۔ جنہیں ساری دنیا The Knights Templar کے نام سے جانتی ہے جو ابتدا میں تعداد میں آٹھ تھے اور زائرین کی حفاظت کے لیے سن 1120 میں فرانس سے آئے تھے۔ انہیں نو سال بعد ایک فوجی دستہ بن کر رہنے کی اجازت مل گئی۔ انہیں یروشلم کے حکمران بالڈوین ثانی نے ان کے سرپرست Warmund (جو فلسطین کا بڑا پادری تھا) کی سفارش پر اقصیٰ القدیم میں رہائش پذیر ہونے کی اجازت دے دی تھی۔ ان کے ہاتھ کچھ ایسے مخفی علوم کے صحیفے لگ گئے کہ وہ بے حد طاقتور اور مالدار ہو گئے۔ فلسطین کے وہ باخبر بزرگ شیخ نائف جو لکھی، سنی اور زبانی تاریخ کا ایک سیل رواں تھے، کچھ دیر کے اور فرمانے لگے کہ اہل اسلام اور اہل یہود جو یہاں آباد ہیں ان میں سے بہت سے لوگوں کا اور کئی محققین کا خیال ہے کہ ان نائٹس کے ہاتھ کچھ ایسے صحیفے آگئے تھے جن میں درج منتر دولت پر قابض جنوں اور دیگر مخلوقات کو اپنا مطیع بنا لیتے تھے۔ یہی وہ نائٹس تھے جنہوں نے تاریخ انسانی کا پہلا بینک قائم کیا۔

”وہ کیسے؟“ یہ میرا مختصر سا حیرت بھرا سوال میرے بہت سے کرم فرماؤں پر بہت بوجھ ڈال دیتا ہے مگر میں اس خزانے کی کنجی جان کر استعمال کرنے سے باز نہیں آتا۔ وہ ایسے کہ ان نائٹس نے یورپ بھر سے یہاں آنے والے زائرین میں یہ بات عام کر دی کہ دوران سفر رقم اور قیمتی اشیاء لے کر آنا خطرے سے خالی نہیں۔ آپ ہمارے دفاتر اور نمائندے جو تمام یورپ میں پھیلے ہیں ان کے پاس مطلوبہ رقم جمع کرائیں۔ وہ ایک پروانہ متبادل Cheque یہ عہد نامہ نقدی جاری Bank Draft کریں گے جو یروشلم میں پیش کیے جانے پر آپ کو کمیشن نکال کر مطلوبہ رقم کا حقدار ٹھہرائے گا۔ ان کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کی وجہ سے پوپ نے فرانس کے بادشاہ کی مدد سے انہیں برباد کر دیا۔

درست فرمایا آپ نے جمعہ 13 اکتوبر 1307 کو یہ سب ہوا تھا۔ میں نے بھی اپنی جزل نالچ کا اظہار کیا! ”درست“ میں یہاں آپ کی خدمت میں عرض کرتا چلوں کہ یہ نائٹس ایک عرصے سے فرانس کی وزارت خزانہ سے منسلک تھے۔ ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سننے میں آتی تھیں۔ ان کے بے جا مداخلت سے سارے یورپ کے حکمران پریشان رہتے تھے۔ یہ اپنے آپ کو اسٹیبلشمنٹ، کنگ میکرز، بین الاقوامی مالیاتی ادارہ، آئی ایم ایف ورلڈ بینک اور وزارت خزانہ جانے کیا کیا سمجھتے تھے۔ انہیں ہر طرح کے ٹیکس اور عدالتی معاملات سے استثنیٰ تھا۔ یہ اپنے معاملات کی انجام دہی میں صرف پوپ کو جواب دہ تھے۔



ایک زمانہ ایسا آیا کہ جب انہوں نے فرانس کے بادشاہ فلپ چہارم کی ہمشیرہ کی شادی کے لیے اور جنگی اخراجات کے لیے ایک بڑی رقم بادشاہ کو ادھار دی تو اسے ان کی دولت کا صحیح اندازہ ہوا۔ اس نے کچھ عرصے بعد ان کی دولت پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا جس میں اسے بڑی مہارت تھی وہ سال بھر پہلے ہی یہودیوں کی فرانس میں دولت پر اسی طرح قابض ہو چکا تھا۔

بادشاہ فلپ چہارم کو اپنے منصوبے پر عمل درآمد کرنے کا موقع اس وقت ملا جب اس وقت کے پوپ کلیمنٹ پنجم کا خط اسے ان کے ٹمپلر نائٹس کی کرپشن اور بد اعمالیوں کے بارے میں موصول ہوا۔ پوپ کی خواہش تھی کہ ایک آزاد تحقیقاتی کمیشن (جس میں ان کے اپنے نمائندے بھی شامل ہوں) اس کی حقیقات کر کے انہیں رپورٹ پیش کرے۔ اس کے برعکس پوپ کو اس وقت شدید دھچکا لگا جب فرانس کے طول و عرض میں اس کی فراہم کردہ لسٹوں کو سامنے رکھ کر بادشاہ کے حکم پر یہ سارے خفیہ نائٹس راتوں رات پکڑے گئے اور انہیں صلیب پر زندہ جلادیا گیا۔ میرے تجسس نے ایک اور اڈاری ماری۔ لیکن یہ روشن خیال مغرب آخر ایک ایسے گروپ کے پیچھے کیوں لگ گیا جو شیاطین کا پجاری ہے؟

ان میں سے کچھ ٹمپلر نائٹس کو جب بادشاہ کے ان ظالمانہ عزائم کا علم ہوا تو یہ بہت خاموشی سے اسکاٹ لینڈ فرار ہو گئے جو پوپ کے اثر و رسوخ اور پہنچ سے باہر تھا۔ وہاں پہلے سے ہی ایک سوسائٹی تھی جس میں راج معمار یعنی اینٹیں چننے والے شامل تھے۔ انہیں Masons ”کہتے تھے۔ یہ بہت منفعت بخش کام تھا۔ انہیں اس میں مہارت بھی بہت تھی اور اس کا یہ معاوضہ بھی بہت لیتے تھے۔ اس لیے کہ وہاں بڑے کلیسا اور قلعے بنانے کا جنون تھا۔



اس سوسائٹی کے ممبران کے پاس بہت رقم تھی یہ اپنے تعمیراتی رازوں میں بھی کسی کو شریک نہ کرتے تھے۔ جب یہ ٹمپلر نائٹس فرانس سے اسکاٹ لینڈ اپنے تومیسن کا حال کچھ پتلا تھا۔ ان کی دولت بھی ختم ہو چکی تھی اسی وجہ سے ان نائٹس کو اس سوسائٹی کی ممبر بننے کی اجازت دی کیوں کہ ان کی دولت اور میزبانوں کی ہنرمندی سے ایک نئی دنیا جس میں پوپ اور مذہب کا عمل دخل نہ ہو وجود میں لانا تھا۔ سوسائٹی کی ممبر شپ کھول دی گئی اور یہ نئے ممبر زفری میسن کہلائے۔

\*\*\*\*\*



قبۃ الصخری اور مسجد الاقصیٰ کے بارے میں جس طرح یہ وثوق سے کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں قدیم ترین اسلامی عمارات ہیں۔ اسی طرح دنیا کی قدیم ترین خفیہ تنظیموں میں فری میسن کا بھی شمار ہوتا ہے جو اب باقاعدہ مغربی مہذب دنیا میں متبادل مذہب کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ اس کا بے ضرر مگر ڈھکا چھپا نعرہ یہ ہے کہ ”ہم اچھے انسانوں کو بہتر انسان بناتے ہیں“ لیکن یہ ایک عرصہ سے اقتدار کے بلند و بالا ایوانوں میں اپنے حلف یافتہ کارکن داخل کرتی رہتی ہے۔ میرے لیے حیرت کا صرف ایک نکتہ تھا کہ کیسے آٹھ ٹمپلر ناٹس کا گیارہویں صدی کا ایک چھوٹا سا حفاظتی دستہ ایک فوجی دستے کی صورت اختیار کر کے آج دنیا بھر کے تعلیمی، معاشی، سیاسی اور حربی اداروں میں اقتدار اور کنٹرول حاصل کر چکا ہے۔

یہاں میں یہ یاد دلاتا چلوں کہ مسلمانوں نے فلسطین یعنی یروشلم پر قبضہ عیسائیوں کو شکست دے کر حاصل کیا تھا۔ وہ نومبر 636 عیسوی میں بازنطینی رومی حکومت کے دور میں یروشلم کے قلعے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

یہ سیدنا عمرؓ بن خطاب کا دور خلافت تھا اور اسلامی افواج کی قیادت ابو عبیدہؓ کے پاس تھی۔ مسلمانوں کو جنگ میں محاصرے کی حکمت عملی سے پہلی بار واسطہ پڑا تھا۔ وہ چار ماہ اسے گھیرے رہے۔ بالآخر وہاں کے قدیم چرچ کے بڑے پادری Sophronius سوفرنیئس نے اپنی جانب سے یہ تجویز رکھی کہ وہ قلعے کی چابیاں کسی سپاہی کے حوالے نہیں کریں گے بلکہ ایک ایسے بادشاہ کو دیں گے جس کا طرز بود و باش فقر کی مانند سادہ اور بے خوف و بے نیاز ہوگا۔ اس کے بارے میں اسے اپنی بائبل میں کچھ اشارے ملے ہیں۔

اس کی یہ تجویز جب وہاں محاصرے کے انچارج مسلمان کمانڈر حضرت شراییلؓ بن حسنہ کو پہنچی تو انہوں نے سوچا کہ سیدنا عمرؓ کو اتنی دور مدینہ سے یہاں آمد کی زحمت دینا مناسب نہیں، کیونکہ ان کی جگہ حمص (شام) سے حضرت خالدؓ بن ولید کو بلا لیا جائے۔ وہ اپنے حلیے اور شبہت میں سیدنا عمرؓ جیسے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ جب سیدنا خالدؓ آئے تو یہودی انہیں پہچانتے تھے۔ اس پر حضرت ابو عبیدہؓ جو مسلمانوں کے سپہ سالار تھے انہوں نے سیدنا عمرؓ کو آمد کی درخواست اور فتح کے معاہدہ پر دستخط کی تجویز بھیجی تو آپ اس شان سے آئے کہ شہر میں داخل ہوتے وقت اونٹ کی نکیل تھامنے کی باری آپ کی تھی اور سواری کا اس فاصلے پر حق آپ کے غلام کا تھا۔ یروشلم میں بارش کی وجہ سے آپ کے ثوب پر یکچڑ کے چھینٹے بھی پڑے ہوئے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر سوفرنیئس بے حد مرعوب ہوا۔

ایک معاہدے کے تحت جسے معاہدہ عمری بھی کہا جاتا ہے اور جس کے گواہوں سیدنا خالدؓ بن ولید، سیدنا معاویہؓ ابن ابوسفیان، سیدنا ابو عبیدہؓ (اللہ ان سب سے راضی ہو) شامل تھے یروشلم 637ء میں آزاد ہوا۔ یہودیوں کو دو سو سال سے اس شہر میں عبادت اور داخلے کی اجازت نہ تھی۔ وہ بھی ملی۔ حضرت عمرؓ یہاں دس دن قیام پزیر رہے۔

میں نے اپنی گھڑی دیکھی رات کے 11:30 بج چکے تھے۔ اپنے میزبانوں سے رخصت چاہی اس وعدے کے ساتھ کہ ہم دوران قیام اور بعد میں بھی انشا اللہ ایک دوسرے کے رابطے میں رہیں گے۔ حاتم کا ارادہ مجھے ہوٹل تک چھوڑ کر آنے کا تھا۔ شیخ نائف نے اسے روک دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ ممکن نہیں کہ تین عربوں اور ایک پاکستانی کی ملاقات کو اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد مانیٹر نہ کر رہی ہو۔ تمہاری رفاقت تم دونوں کے لیے بہتر نہیں۔ اس سے مصطفیٰ بھائی کے لیے بھی معاملات پیچیدہ ہو جائیں گے۔ انہیں اکیلا ہی جانے دیں۔ اس انکشاف کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھ ہی لیا کہ کیا آپ خوف زدہ ہیں۔ میرے چہرے پر ایک پھکی سی مسکراہٹ نے میرے خوف کا احاطہ کر لیا۔ میں آرام سے اپنے ہوٹل پہنچ جاؤں گا آپ تردد نہ کریں۔

واپسی پر شہر قدیم ایک گہری نیند میں سویا تھا۔ راستے میں پانچ چیک پوسٹوں پر میں نے نیم خوابیدہ یہودی سپاہیوں کو انہیں کا shalom (سلام) گر جموشی سے کیا تو مجھے لگا شیخ نائف ان سے اور موساد سے بلاوجہ ہی خائف رہتے ہیں۔ میں رات بھر ایک عجیب عالم سرشاری اور اطمینان سے بچوں کی مانند سویا رہا۔ صبح جب کھڑکی سے نظر باہر ڈالی تو آسمان میں بادل ایک دوسرے کے تعاقب میں دوڑے پھرتے تھے۔ رات کے کسی پہر ہونے والی ہلکی ہلکی بوند باندی نے شہر کو دھوکرا جلا کر دیا تھا۔







ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں تین کپ کافی نے مجھے مکمل طور پر حالت بیداری میں لوٹا دیا۔ ارد گرد نگاہ دوڑائی تو وہاں کوئی اور مہمان نہ تھا۔ جب میں نے باہر جانے کا ارادہ کیا تو رفیق صاحب لاؤنج میں دکھائی دیے ان سے علیک سلیک ہوئی تو انہوں نے میرا آج کا پروگرام پوچھ لیا۔ میں نے جب بتایا کہ اس شہر قدیم میں آج میرا ارادہ ادھر ادھر بھٹکنے کا ہے۔ میری تجویز ہے کہ آپ The Mount of Olives (جبل الزيتون جسے عرب الطور کے مختصر لقب سے پکارتے ہیں جو آرمینی زبان کا لفظ ہے) وہاں چلے جائیں۔ موسم خوشگوار ہے۔ ایسے میں وہاں جانا آپ کے لیے بہت پر لطف تجربہ رہے گا۔ اس کی تجویز مجھے بہت من بھادنی لگی اور سفر کی ہدایات لے کر میں چل پڑا۔ دھلا دھلایا یروشلیم اس صبح جگمگا رہا تھا۔ لیکن اس شہر میں ایک مجذوب کا سا باؤلا پن ہے جو ہر کس و ناکس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کے لیے آپ کو ایک وسیع کینوس پر تاریخ، مذہبی تقابلی جائزے، سیاسی ریشہ دوانیوں سے آگاہی کے خطوط کھینچنے اور رنگ بکھیرنے پڑتے ہیں۔ یہ سب کرنے کے لیے آپ کے اندر مظلوموں کی بے چارگی پر اشک بار، سوگوار دل اور بچوں کا سا تجسس بھی باہر نکالنا پڑتا ہے جو ساکٹ میں جھٹکوں سے بے پروا ہو کر انگلی ڈالنے سے باز نہ آتا ہو۔ اس صبح مجھے یروشلیم ایک سادہ لوح، رومانچک اور انوکھے پن سے آراستہ لگا۔

ہوٹل سے باہر نکلتے ہی 15 سے 20 اسرائیلی فوجی کسی عرب دکاندار سے چمیلیں کر رہے تھے۔ میں چلتا چلتا باب الاسباط جسے عرف عام میں Lion gate کہتے ہیں، پہنچ گیا۔ اسی دوران میری نگاہ ایک قبرستان پر پڑی جو اپنے مقابر (عربی میں واحد مقبر) کے اعتبار سے مسلمانوں کا لگ رہا تھا۔ یہ اب میری عادت کا معاملہ بن چکا ہے کہ میں جب کبھی بیرون ملک کسی ایسے حصے میں ہوں جو مسلمانوں کا



قبرستان ہو تو میں وہاں رک کر اجتماعی فاتحہ پڑھنا اپنے اوپر قرض اور فرض دونوں ہی سمجھتا ہوں۔ قبرستان میں داخل ہوا تو ہزار ہا مسلمان ایک اونچے اونچے وسیع میدان میں مدفون دکھائی دیے۔ قدیم مقابر فیصل شہر کے نزدیک ہیں۔ انہیں مقابر میں دو صحابہ کی قبور بھی موجود تھیں۔ یہ دو صحابی سیدنا عبادہ ابن سامت اور عاص ابن شداد ہیں۔ سیدنا عاصؓ کے قدموں کے پاس ہی خلافت عثمانیہ کے عظیم فرمانروا سلیمان عالیشان کی قبر ہے جس پر یہاں تو کوئی کتبہ درج نہیں لیکن اگر آپ استنبول شہر کی مسجد سلیمانیہ میں جائیں تو اس کی منظور نظر ملکہ حرم سلطان کی تربت (ترکی میں قبر کو مزار یا تَرْب بھی کہتے ہیں) کے باہر ایک یادگاری ستون نصب ہے جو اس کی اس قبر کی نشاندہی کرتا ہے۔

فاتحہ خوانی سے فارغ ہو کر میں شہر کے قدیمی بازار میں آن نکلتا ہوں، ہجوم خریدار اور حرص تاجراں نے ایک بے ہنگم صوتی روپ دھار لیا ہے۔ بلاوے اور بھاؤتاؤ کا ایک آکسٹرا ہر طرف سنائی دے رہا ہے جس میں لے تان کے بغیر بس رقم اور مال کا تبادلہ ہی مقصد متاع بازار ہے۔



عرب خواتین سڑک پر سجائے ہوئے اسٹالوں سے روزمرہ کا سودا خرید رہی ہیں۔ وہی ہماری عورتوں کا سا بھاؤتاؤ کا انداز۔ موسم سے لطف اندوز ہوتے مرد پاس ہی تھڑوں پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ اس ہجوم خریداروں کے درمیان سے میں آہستہ آہستہ گزر کر جبل الزیتون کی جانب بڑھ رہا ہوں جس کی ڈھلان شہر سے جڑی ہوئی ہے۔ ایک زمانہ ہوتا تھا یہاں زیتون کے ہزار ہا درخت ہوتے تھے



جس کی وجہ سے اس کا یہ نام پڑا۔ اس کے دامن میں کئی ایسے کولہو بھی تھے جنہیں آپ آئل مل کا نام دے لیں۔ اب ایسا نظارہ دکھائی نہیں دیتا۔

جبل الزیتون کی یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاں بہت اہمیت ہے۔ مسلمان دینی حوالوں سے اس سے ذرا لا تعلق سے ہیں۔ یہودیوں کا خدا جسے وہ Yahweh کہتے ہیں اور جو ہمارے تصور وحدانیت کے حساب سے دنیا کے باقی تمام مذاہب کی نسبت قریب ترین ہے کہ وہ یکتا ہے، دکھائی نہیں دیتا۔ ازل تا ابد قائم رہنے والا اور ہر شے کا خالق و مالک ہے، وہی ابراہیم، اسحق اور یعقوب موسیٰ علیہا السلام کا رب ہے جس نے انہیں فرعون کے مظالم سے نجات دلا کر سیدنا موسیٰ کے ذریعے توریت عطا کی۔ وہ عبرانی زبان میں جس طرح اللہ لکھتے ہیں وہ غور سے دیکھنے پر عربی میں لکھے گئے لفظ اللہ کا عکس معکوس لگتا ہے اور وہ اسے انگریزی میں YHWH لکھتے ہیں۔ وہ اللہ کو Elohim بھی کہتے ہیں جو سننے میں ہمارا اللہ لگتا ہے۔ یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ روز قیامت یہووا، اسی جبل الزیتون پر جلوہ افروز ہوگا۔ پہاڑ اس دن پھٹ کر دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ یہ روز قیامت کی نشانی ہے۔ اس کی ڈھلوان پر اہل یہود دفن ہونا عین سعادت سمجھتے ہیں۔ ان ڈھلوانوں پر نگاہ ڈالیں تو یہود کی کوئی ڈیڑھ لاکھ قبو جلوہ الہی کی منتظر دکھائی دیتی ہیں۔



عیسائیوں کا معاملہ ان سے قدرے مختلف ہے جو عیسیٰ ابن مریم کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں، قرآن کہتا ہے کہ ”یہ اس قدر شرمناک اور بھیانک بات ہے کہ اگر یہ پہاڑوں زمین اور آسمانوں کی سمجھ میں آجائے تو وہ شرم و ندامت سے پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں“ (سورۃ مریم آیت نمبر 89 تا 90)۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کا دنیا میں دوبارہ ظہور اسی پہاڑ پر ہوگا۔ وہ ہمیں یہیں سے اتر کر مشرقی دروازے سے یروشلم شہر میں

داخل ہوں گے۔ اس کے گرد و نواح میں بے شمار چرچ ہیں اور حضرت مریم کا مزار مبارک بھی یہیں پر ہے جہاں ہمہ وقت سیاحوں کی آمد جاری رہتی ہے۔

موسم خوش گوار ہونے کے باعث میں کسی دشواری کے بغیر بیس فٹ اونچی ایک ایسی عمارت میں جا پہنچا جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اسلام کا مقبرہ ہے جو سیدنا سلیمانؑ کا سویلا بھائی اور حضرت داؤد علیہ سلام کا بیٹا تھا۔ تاریخ اسے اپنے والد محترم سے بغاوت کرنے کی وجہ سے اچھا نہیں سمجھتی۔ باپ بیٹے کی اس جنگ میں ایک روایت کے بموجب پہلے تو حضرت داؤد علیہ سلام کو اسلام کے ہاتھوں شکست ہوئی تھی اور وہ یہاں جبل الزیتون میں آن کر چھپ گئے تھے لیکن بعد میں انہوں نے اپنے اس بیٹے پر فتح پائی۔ اس کی جنگ میں ہلاکت ہوئی، وہ یہاں مدفون ہے ایک عرصے تک اس شہر کے لوگ آتے جاتے اس مزار کو کنکریاں مارتے تھے۔ یہ عمل بہت برسوں تک جاری رہا حتیٰ کہ یہ مزار سنگ باری کی وجہ سے ڈھیر میں چھپ گیا۔ شہر کے لوگ اپنے بچوں کو یہ مقام عبرت دکھانے لاتے تھے پھر آج سے تیرہ سال پہلے یعنی 2003 میں مورخین کو یہاں درج ایک کتبہ پڑھنے کا اتفاق ہوا تو عجب انکشاف ہوا کہ یہ تو عیسائیوں میں مقدس سمجھے ذکریا کا مزار ہے جو شہید یحییٰ یعنی John the Baptist کے والد تھے۔ اسی انکشاف کی وجہ سے اس مزار کا درجہ، رتبہ، حلیہ یکایک بدل گیا۔ اب رات کو یہاں نیلی روشنیاں اس طرح جگمگاتی ہیں کہ ان پر دور سے اہرام مصر کا گماں ہوتا ہے۔

ذرا ٹھہریے اس مزار کو آپ حضرت یحییٰ کے مزار سے گڈ مڈ نہ کریں۔ ایک اور مزار ایسا ہے جو ایک ایسے نبی کا ہے جو حضرت عیسیٰ سے 900 سال پہلے ہو گزرے ہیں اور قرآن میں مذکور نہیں۔ انہیں زکریا بن یہودا کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

\*\*\*\*\*





Garden of Gethsemane

یہاں سے آدھا میل سے کچھ زیادہ فاصلے پر یعنی Garden of Gethsemane واقع ہے۔ باغ کی دیکھ بھال آج بھی بہت عمدہ انداز میں کی جاتی ہے۔ Gethsemane آرمینی زبان کے لفظ manêŠGad کی یونانی شکل ہے اس کا مطلب زیتون کا تیل نکالنے کا کوہو ہے۔ ممکن ہے اس طرح کا صنعتی اہتمام اس زمانے میں وہاں موجود ہو۔ باغ میں موجود کچھ درختوں کی قدامت کا اندازہ انہیں دیکھ کر بھی لگایا جاسکتا ہے۔ دیگر درختوں کی نسبت ان میں سے کسی کی عمر کا صحیح تعین اس لیے نہیں کیا جاسکتا کہ زیتون کے درخت میں حلقے یعنی رنگ نہیں ہوتے جس کی وجہ سے ان کی carbon dating نہیں کی جاسکتی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق یہ گیارہویں صدی اور بارہویں صدی میں لگائے ہوئے پودے ہیں جو بلاشبہ انہیں تاریخ کے قدیم ترین زیتون کے درخت ہونے کا امتیاز بخشتی ہے۔

یہیں پر ذراہٹ کر Church of All Nations یعنی کلیسہ آلام ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں بڑے بڑے پتھروں کے درمیان حضرت عیسیٰ نے اپنی گرفتاری سے پہلے رات بھر عبادت کی تھی۔



Church of All Nations

یعنی کلیسہ آلام یہ وہ مقام ہے جہاں بڑے بڑے پتھروں کے درمیان حضرت عیسیٰ نے اپنی گرفتاری سے پہلے رات بھر عبادت کی تھی۔ یہیں پر ذراہٹ کر Church of All Nations یعنی کلیسہ آلام ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں بڑے بڑے پتھروں کے درمیان حضرت عیسیٰ نے اپنی گرفتاری سے پہلے رات بھر عبادت کی تھی۔ وہ یہیں سے گرفتار ہوئے تھے۔ ذرا سا آگے جا کر انتہائی بائیں جانب ایک پگڈنڈی آپ کو الطور کی بلندی پر لے جاتی ہے۔ یہ ڈھلوان بہت کھڑی ہے۔ میری ایک عمر چونکہ کوہ پیمائی اور ٹریننگ میں گزری ہے لہذا میری ٹانگیں اور پھیپھڑوں کو یہ چیلنج قبول کرنے میں کوئی تاثر نہیں، میں فوراً ہی چڑھائی شروع کر دیتا ہوں، میدان میں ٹیکسیاں ہیں جو سیاحوں کو بیس شیکل کے عوض پہاڑ کی چوٹی پر لے جاتی ہیں۔ چالیس منٹ بعد میں اسی چوٹی پر جا پہنچتا ہوں۔



یہاں پر اب میرے سامنے ایک عمارت ہے جسے عرب کنیسۃ الصعود کہتے ہیں لیکن عیسائیوں میں اس کو Church of Ascension کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہاں ایک چٹان ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰ یہاں سے آسمانوں میں تشریف لے



گئے۔ اس چھوٹی سی ہشت پہلو عبادت گاہ Aedicule کو اسی چٹان پر اس طرح سے تعمیر کیا گیا۔ عیسائیوں کی جانب سے یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ نشان تو اس چٹان پر یسوع مسیح کے دونوں ہی قدموں کے تھے مگر سلطان صلاح الدین ایوبی یہاں سے چٹان کا وہ حصہ توڑ کر اقصیٰ لے گئے جس پر بائیں پاؤں کا نشان تھا۔ مسجد اقصیٰ کی انتظامیہ اور مسلمان مورخ اس الزام کو یکسر رد کرتے ہیں۔ ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ تین صدیوں تک تو یہ عمارت بے نام و نشان رہی تھی۔ اس کا کوئی پرسان حال بھی نہ تھا۔ اس دوران اگر کسی نے یہاں توڑ پھوڑ کی ہو اور عین ممکن ہے وہ اسے لے اڑا ہو۔ ابتدائی عیسائی پیروکار یہاں چھپ چھپا کر حضرت عیسیٰؑ کے مصلوب ہونے کے بعد اپنی عزاداری اور عبادت کے لیے جمع ہوتے تھے۔

ہم مسلمانوں کے عیسائیوں سے جو تین بنیادی اختلاف ہیں ان میں ایک تو حضرت عیسیٰؑ کا مصلوب ہونا، دوسرا عیسائیوں کا انہیں اللہ کا بیٹا قرار دینا اور تیسرا تثلیث کا مسئلہ ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے دنیا میں آخری مقام قیام کی رو سے اس کی عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں کے ہاں مقدس حیثیت ہے لیکن مسلمان قرآن کی رو سے ان کا آسمانوں میں اٹھایا جانا بہت وسیع المعنی تناظر میں تسلیم کرتے ہیں۔ قرآن الکریم اس حوالے سے رَفَعَهُ اللہ کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔

یہاں ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ قرآن کا بیان یہ ہے کہ قرآن کا بیان یہ ہے کہ یعنی سورۃ النساء کی آیت نمبر ” 157-158 اور یہ کہنے کے سبب کہ ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو جو اللہ کے پیغمبر تھے قتل کر دیا ہے۔ وہ جان لیں کہ نہ تو وہ قتل ہوئے نہ ہی مصلوب بلکہ انہیں اس حوالے سے شبہ میں مبتلا کر دیا گیا تاکہ وہ باہمی اختلاف میں پڑ جائیں اور شکوک و شبہات میں گھرے رہیں وہ اسی کی پیروی میں بھٹک رہے ہیں اور وہ اس سے لاعلم ہیں لیکن یہ امر مصدق ہے کہ عیسیٰؑ کو ہرگز قتل نہیں کیا گیا۔ اللہ نے انہیں اپنی طرف اٹھالیا۔ بے شک اللہ غالب اور حکیم ہے۔“

صلاح الدین ایوبی نے یروشلم فتح کرنے کے بعد اس کو ایک مسجد میں بدل دیا تھا لیکن اپنی اس غلطی کا احساس ہونے پر انہوں نے اسے اس کی پرانی حیثیت پر بحال کر دیا اور مسجد اس کے قریب ہی ایک خالی جگہ پر تعمیر کی گئی ہے۔

اس کلیسا کے متولی عیسائی عرب ہیں۔ جب میں وہاں سے کوئی نذرانہ دیے بغیر لوٹنے لگا تو انہیں بہت بُرا لگا۔ میں نے اس خیال سے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جذبہ خیر سگالی کو میری اس کنجوسی کی وجہ سے کوئی کاری ضرب نہ لگے، جلدی سے جیب سے کچھ شیکل نکالے اور قدمچہ مبارک کے قریب رکھے نذرانہ بکس میں انڈیل دیے، جس کی دید سے متولی کی روحانی مسکراہٹ عود کر آئی۔ انہوں نے بہت زور سے اپنا دایاں انگوٹھا چٹان پر رگڑا اور میرے ماتھے پر گناہوں سے بخشش کا تلک لگا دیا۔ میں نے بھی عافیت اسی میں جانی کے میں اپنا رہا اسلام بچا کر مسکراتے ہوئے اُلٹے قدموں سینے پر ہاتھ رکھے، اظہار عقیدت سے نیم خمیدہ کمر کیے باہر نکل



آؤں۔ میری نگاہیں ان ہجوم متولیان پر تھیں جن کے چہرے پر اب ایسی یقین دہانی ان کی بوڑھی آنکھوں، مڑے تڑے لبوں اور بے ترتیب طویل ڈاڑھیوں سے چھن کر آرہی تھی گویا ان کی اس خاک شفا و نجات نے میرے وجود پر گہرا روحانی اثر ڈالا ہے۔

اس معبد سے باہر نکلا تو میری نگاہ وادی کیدورن سے دوسری جانب قبتہ الصخری پر پڑی۔ مجھے ایک عجیب سے پر اسرار احساس نے گھیر لیا کہ، دو مختلف مذاہب، دو مقام، ایک جیسی اہمیت، ایک جیسی اونچائی، ان کا فضائی فاصلہ بھی کچھ زیادہ نہیں، یہ کیسی دو چٹانیں ہیں کہ ان پر قدم رنجہ ہو کر ان سے اللہ کے دو برگزیدہ بندے اس کے دو پیارے نبی سائنس کو ہکا بکا چھوڑ کے اوپر آسمانوں میں چلے گئے۔ اللہ اللہ! کیا مقدس سر زمین ہے، کیا اسرار روحانی ہیں۔ اپنی شہر آفاق کتاب ”کشف المحجوب“ میں حضرت عثمان علی ہجویری کہتے ہیں ”پہلے روحانیت ایک بے نام حقیقت تھی، اب یہ محض ایک نام بن کر رہ گئی ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔“

اسی کلیسا کے پڑوس میں ایک مقبرہ ہے۔ اکثر قدیم مقابر کی طرح اس میں بھی اصل قبر تہہ خانے میں ہے مگر اس کا تعویذ یعنی قبر کی تعمیراتی علامت اوپر ہے۔ اس مقبرے پر بھی تینوں مذاہب کا جھگڑا ہے۔ یہودیوں کا خیال ہے کہ یہ بنی اسرائیل کی ایک ایسی خاتون تھیں جو نبی کی ہم منصب تھیں۔ عیسائی کہتے ہیں کہ چھٹی صدی کی یہ ایک راہبہ تھی جس نے عشق عیسیٰ میں دنیا تج دی اور کچھ مسلمان اسے حضرت رابعہ بصری کا مزار مانتے ہیں۔ یروشلم کے مسلمان البتہ اس سے کچھ ہٹ کر سوچتے ہیں۔ حضرت رابعہ بصری کا مزار ان کے آبائی وطن بصرہ عراق میں ہی ہے۔ مجھے بعد میں بتایا گیا کہ یہ دراصل رابعہ شامی کی قبر ہے۔ ان کا ماضی بڑا اعدا رہا تھا۔ مگر اللہ نے ان کے دل کو پلٹ دیا۔ ایک خواب آیا۔ ایک منظر دکھائی دیا اور یہ یہاں تشریف لے آئیں۔ جم کر اللہ کی اس ویرانے میں عبادت کی۔ اسی وجہ سے اس مقبرے سے جڑی مسجد کا نام بھی انہیں کے اسم پاکیزہ پر یعنی مسجد رابعہ ہے یہاں ہر جمعہ کی شب (ہماری جمعرات) کو ایک محفل ذکر منعقد ہوتی ہے۔ یہ محفل ذکر یروشلم کی سب سے بڑی محفل ذکر الہی سمجھی جاتی ہے۔ یہاں شطاریہ سلسلے کے بزرگ محفل ذکر برپا کرتے ہیں۔ ان بزرگوں میں شیخ نائف بھی شمار ہوتے ہیں۔

شطاریہ (برق رفتار) سلسلہ ویسے تو نقشبندی سلسلے کی ذیلی شاخ ہے مگر اس کے بانی شیخ عبداللہ شطاری کا تعلق شیخ شہاب الدین سہروردی کے خانوادے سے تھا۔ اس سلسلے کی آمد پر اسے ہندوستان میں مغلیہ دربار میں بہت پزیرائی ملی۔ موسیقار تان سین اس سلسلے کے ایک بڑے بزرگ حضرت غوث کا مرید خاص تھا۔ مرشد محترم اور مرید باکمال دونوں ہی گوالیار راجھستان بھارت میں ایک ہی مزار کے احاطے میں مدفون ہیں۔

میری اسرائیل آمد محض ایک تجسس اور انجانی حقیقت سے تعارف تھا جس پر تعصب اور پروپیگنڈے کی کہر چھائی ہوئی ہے۔ خیال یہ تھا کہ اپنے کچھ سوالات کے جواب مل جائیں تو شادماں و فرحان لوٹ جاؤں گا لیکن چند ہی دنوں کے قیام میں مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ اس

سرزمین قدیم و مقدس سے ماضی میں میری ادراک و آشنائی کو اب ایک نیارنگ و روپ مل رہا ہے۔ بہت آہستگی سے تاریخ پرت درپرت میرے لیے کچھ نئے باب کھول رہی ہے۔

کلیسہ الصعود Church of Ascension سے باہر نکلا تو خود کو میں نے ایک عجیب کیفیت جذب و خود کلامی میں پایا۔ مجھے لگا کہ میری شخصیت کئی حوالوں میں بٹ گئی ہے۔ جو دیکھا اور سنا وہ میرے اندر اپنے حساب سے جگہ بنا رہا ہے جس میں میرے شعور کو ایک طرف باندھ کر رکھ دیا گیا۔ خیالات کے انہیں تانوں بانوں میں مالا کے دھاگے کی مانند الجھا ایک تنگ سی پگڈنڈی سے چلا جا رہا تھا کہ دو عیسائی فلیپانا نظر آئیں، میرے دوست کہتے ہیں عام طور پر فلیپائی خواتین مردوں کو دیکھ کر خوش بھی جلد ہوتی ہیں اور مل کر اتنا ہی جلدی مایوس بھی ہو جاتی ہیں۔ مجھے بڑبڑاتا دیکھ کر زور سے ہنسیں تو میں نے اس کا الزام اپنی خود کلامی اور وحشت دل سے زیادہ ان کی فطری خوشی کو دیا اور انہیں مزید مایوسی سے بچانے کے لیے دوسری طرف مشرقی یروشلم میں عرب حصے کی جانب اُتر گیا۔ جلد ہی میں ایک ایسے ہوٹل کے پاس آ گیا جس کا نام سات محراب والا ہوٹل (Seven Arches Hotel) ہے۔ یہ پہلے یروشلم انٹرکانٹیننٹل ہوٹل تھا۔ یہ ہوٹل کبھی اردن کے شاہ حسین کی ملکیت تھا۔ اب اسرائیلی حکومت کی متروکہ جائیداد کا بورڈ اس کا انتظام چلاتا ہے۔

یہاں سے یروشلم کا ایسا نظارہ دکھائی دیتا ہے کہ آپ پورے شہر پر ایک مکمل طائرانہ نگاہ ڈال سکتے ہیں۔ دنیا میں بڑے ہوٹل اس کا خاص اہتمام کرتے ہیں کہ ان کے قرب و جوار میں عوامی سہولت کا کوئی مستقل مرکز نہ ہو جہاں عوام کی آوک جاوک ہر وقت لگی رہے۔ اس ہوٹل کے ساتھ ہی ایک اسکول تھا جہاں اس وقت آدھی چھٹی یعنی recess time ہوا تھا۔ اس کے درمیانہ رقبے کے صحن میں اسکارف میں ملبوس فرشتوں کی سی معصوم عرب بچیاں دوڑ بھاگ رہی تھیں۔ اسکول کے گیٹ کے باہر کچھ ٹھیلے والے بھنی ہوئی مونگ پھلی۔ گڑیا کے بال (candy-floss) فروخت کر رہے تھے۔ میں ان کے دکتے معصوم چہرے دیکھنے لگا جن پر آنے والے واقعات کے سائے اب تک نہیں پڑے تھے۔ ایک سات آٹھ سال کی بچی انہماک سے ذرا دور ہٹ کر چرخے پر لپٹی سرخ رنگت کی جالے دار چینی سے بنے گئے بال حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے لگا کہ اس کے پاس اسے خریدنے کے لیے پیسے نہیں۔ میں نے ایک شیکل سے اس کے لیے وہ گلدستہ شریں خرید اور پیش کیا تو وہ ہچکچائی، خفت سے گلابی ہو گئی اور میرے اصرار پر دونوں ہاتھوں سے اسے جلدی سے لے کر ہرن ہو گئی۔ میں جواب میں صرف شکر آہی سن سکا۔ اسکول کے دروازے پر رک کر اس نے ایک دفعہ مڑ کر مجھے دیکھا، ہاتھ ہلایا اور اندر داخل ہو کر سیاہ حجابوں کے ایک گرداب میں گم ہو گئی۔

میرے علم میں یہ بات تو بہت پہلے سے رہی تھی کہ عربوں میں سب سے خالص، بے داغ عربی زبان فلسطینی عرب بولتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ عرصہ ہائے دراز سے ان کی زبان اور ثقافت میں کسی بیرونی زبان اور ثقافت کی گھلاوٹ نہیں ہوئی۔ زبان، طرز بود و باش کے علاوہ ان کے کھانے بھی بے حد لذیذ اور مستند سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں نسوانی حسن کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ اتنا پاکیزہ، کھرا، دھیمادھیم، اجلا اجلا سا حسن کہیں اور دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے لگا ان نازنین جمال افروز کو بناتے وقت اللہ میاں نے نوبیا ہتا گائے کے مکھن اور سفید بیر Accacia کے شہد سے بنایا ہوگا۔ ان کی مٹی بھی کسی صاف شفاف سرزمین سے لی گئی ہوگی۔

\*\*\*\*\*



### مسجد حضرت سلمان فارسی

اسکول سے آگے بڑھ کر میں کوئی آدھا کلو میٹر ہی چلا تھا کہ میری نگاہ کے اچانک سامنے مسجد حضرت سلمان فارسی آگئی۔ سیدنا سلمان ان جید صحابہ میں تھے جن کے مشورے پر مدینے کا دفاع کفار سے تیسرے غزوے (وہ جنگ جس میں ہمارے رسول مقبول ﷺ خود شریک رہے ہوں) میں خندق کھود کر کیا گیا۔ ابتدا میں ان کا تعلق ایک زرتشت یعنی پارسی ایرانی آتش پرست خانوادے سے تھا۔ دین حق کی تلاش انہیں پہلے عیسائی کلیساؤں میں لے گئی۔ جذبہ ایمان وہاں اطمینان بخش انداز میں سیراب نہ ہو پایا تو وہ ہمارے پیارے نبی محمد مصطفیٰ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ جہاں انہیں لگا کہ یہی وہ عظیم المرتبت ہستی ہیں اور انہیں کا پیغام انسانیت کی فلاح اور نجات کا باعث ہے۔ یہاں یہ بات بھی مشہور ہے کہ آپ کا مقبرہ مبارک بھی مسجد ہی کے احاطے میں موجود ہے لیکن کچھ لوگ اس سے



جداگانہ رائے رکھتے ہیں۔ وہ اسے آپ کا آستانہ عالیہ بتاتے ہیں۔ ان کا مرقد عالیہ کسی اور مقام پر ہے۔ میرے لیے یہی بہت ہے کہ میرے پیارے نبی کے ایک پیارے صحابی کا اس مقام سے کسی طور کوئی نہ کوئی واسطہ رہا ہے۔

جبل الزیتون کی مغربی سمت میں اوپری ڈھلان پر ایک زیر زمین مرقد ہے جسے وہاں مرقد الانبیاء کہتے ہیں۔ توریت میں مذکور حضرت عیسیٰؑ سے پانچ صدیاں قبل ذکر کیا ہوا جانی اور مالاخی کی قبور بھی یہاں پر ہیں۔

مرکزی دروازے پر تالا لگا ہوا دیکھ کر میں نے کھڑکی کے رنگ برنگے شیشوں سے اندر جھانکا۔ مسجد کی محراب تو دکھائی دی مگر کوئی مرقد نظر نہ آیا۔ کئی دفعہ ہیلو کہا مگر جواب نہ دار۔ میں گھوم کر مسجد کی پشت پر چھوٹی سی راہداری میں یہ سوچ کر چل پڑا کہ ممکن ہے کوئی یہاں بیٹھا ستارہا ہو۔ وہ بھی قلب صوفی کی مانند خالی تھی۔ پشت پر ایک چھوٹے سے لکڑی کے دروازے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ معمولی سی زور آزمائی سے کھل جائے گا۔ ایسا ہی ہوا۔ میں نے دروازہ کھولا تو مسجد میں صفیں بچھیں تھیں۔ باہر صحن کی جانب آیا تو ایک جگہ عربی میں لفظ وضو لکھا ہوا دکھائی دیا۔ وہیں ایک بورڈ بھی نصب تھا۔ اس بورڈ پر سیدنا سلمان فارسیؓ سے منقول کئی احادیث مبارکہ بھی درج تھیں۔ بطور پاکستانی مسلمان یہ میرے لیے بہت حیرت کی بات تھی کہ قریب ہی کسی فن کار کی بنائی ہوئی ایک تصویر تھی جس میں جنگ خندق کی منظر کشی کی گئی اس پینٹنگ میں کئی صحابہ بشمول سیدنا سلمان فارسیؓ خندق کے گرد کھڑے تھے۔ انہیں البتہ رخ مبارکہ کے گرد بنے ہوئے ایک روشن دائرے سے نمایاں کیا گیا تھا۔ میرا ارادہ اس کی فوٹو لینے کا تھا مگر نوٹس بورڈ کے نیچے بنے کمرے پر سرخ X کی ممانعت آڑے آگئی۔ میں نے سوچا یہاں مجھے کون دیکھ رہا ہے۔ اس وقت تو میں یہاں اکیلا ہوں اور کون سا مجھے یہاں بار بار آنا ہے۔ میں نے کمرے کو سیدھا کیا۔ ممکن تھا کہ میں یہ تصویر لے لیتا مگر مجھے میرے والد مرحوم کی نصیحت یاد آگئی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ تمہارے کردار کی سب سے کڑی آزمائش اس وقت ہے جب کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔ خود ہی ذرا اثر مند ہو کر میں نے کمرہ بند کیا، اپنے والد کے لیے دعا کی اور مسجد کے اندر لوٹ آیا۔ محراب کے سامنے بیٹھ کر یہ سوچنے لگا کہ ممکن ہے کوئی آجائے تو میں اس سے ان کی قبر مبارک کا نشان پوچھ لوں۔ تیس منٹ تک وہاں زندگی کے کوئی آثار نہ دکھائی دیے تو میں کھڑا ہو گیا اور ادھر ادھر گھومنے لگا کہ اچانک جائے نماز کے کنارے ایک سبز پردہ دکھائی دیا۔ اسے ہٹایا تو ایک دروازہ ذرا سی زور آزمائی سے ایک وسطی سائز کے کمرے میں کھل گیا۔ اس کے فرش پر سبز قالین بچھا تھا۔ سامنے دیوار پر ایک چھوٹی سی کھڑکی کھلی تھی۔ اس کے پار وہ علاقہ دکھائی دے رہا تھا جہاں سے میں مسجد کی طرف آیا تھا۔ یہیں بائیں جانب سیدنا سلمان فارسیؓ کا مزار مبارک بھی تھا۔ میں وہاں پندرہ منٹ تک رہا اور مسجد کے عقبی دروازے سے جبل الزیتون والے مین روڈ پر باہر نکل آیا۔ یہاں سیاحوں کی بھرمار تھی۔



جبل الزیتون کی مغربی سمت میں اوپری ڈھلان پر ایک زیر زمین مرقد ہے جسے وہاں مرقد الانبیاء Tombs of the Prophets کہتے ہیں۔ توریت (جسے اب یہودی بائبل بھی کہا جاتا ہے) میں مذکور تین انبیاء Malachi Haggai Zechariah, and Malachi Haggai Zechariah ذکر کیا، ہاجائی اور مالانچی (جن کا تعلق حضرت عیسیٰؑ سے پانچ صدیوں پہلے سے ہے) کی قبور یہاں پر ہیں۔ میری معلومات محدود تھیں۔ وہاں پہنچا تو بوڑھے یہودی گارڈ نے کھڑے ہو کر بہت گرمجوشی سے ”شلوم“ کہا۔ اسے انگریزی بہت کم آتی تھی مگر وہ پھر بھی مجھے یہ سمجھانے میں کامیاب ہو گیا کہ اندر اندھیرا بہت ہے۔ میں نے اسے اپنے سیل فون کی ٹارچ دکھائی تو وہ کچھ کہے سنے بغیر غائب ہو گیا اور اپنے چھوٹے سے کیبن سے ایک سیاہ رنگ کی موٹی سی موم بتی نکال لایا۔ مرقد الانبیاء میں داخلہ مفت تھا مگر میں نے موم بتی کے عوض اسے کچھ شیکل دینا چاہا تو اس نے قدرے سختی سے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور آسمان کی جانب اشارہ کر کے کہنے لگا ”یہوا، یہوا“ روشنی کا یہ انتظام فی سبیل اللہ تھا گواہ کی دفعہ یہ یہودی خدا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا تو اس کے پوئلے منہ اور بے دانت لبوں پر مسکراہٹ کے بادل تیرنے لگے۔

\*\*\*\*\*

مرقد الانبیاء میں اندھیرے کی وجہ روشنی کی عدم موجودگی نہ تھی بلکہ ایسا لگتا تھا کہ یہاں اجالے کی کسی کرن نے کبھی جھانکا ہی نہ تھا۔ اس گارڈ کی فراہم کردہ موم بتی کی روشنی سے اس شدید اندھیرے میں صرف دو قدم تک دکھائی دیتا تھا۔

اجنبی قدیم مقامات پر ماہرین آثار قدیمہ اس طرح کی تنہا مہم جوئی کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ ایک غلط قدم، ایک غلط موڑ، کوئی گڑھا، کوئی کنواں، کوئی تہ خانہ، اور آپ برسوں پرانی تاریخ کی آغوش میں ایسے پہنچ جائیں گے جیسے قرآن کی سورہ القارعہ کے بیان میں ہاویہ کا ذکر ملتا ہے (ہاویہ یعنی دوزخ کی پاتال، تمہیں کیا پتہ کہ وہ کیا ہے، وہ چنگھاڑتی ہوئی آگ۔ قرآن الحکیم کی اس تشبیہ پر قربان جاییے کہ وہ اس بدترین آگ کو گناہ گار کی ماں قرار دے رہا ہے۔ وہ اسے اپنی آغوش میں ایسے سمیٹ کر رکھے گی جیسے ماں اپنے نو مولود بلو نگرے کو چوم چوم کر سینے سے لگاتی ہے۔

مجھے ڈر لگا۔ دل نے کہا آ، اب لوٹ چلیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سیاح یہاں نہیں آتے۔ میں نے مڑنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ کہیں سے مجھے ایک بہت مدھر سا گیت نسوانی آواز میں سنائی دیا جس کے الفاظ تو میرے پلے نہیں پڑ رہے تھے مگر اس کی گنگناہٹ میں ایک نرم سی مانوسیت تھی۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ یروشلم ایک ایسا خرابہ جہاں ہے جس میں انسانوں کے علاوہ بھی بہت سی انجانی مخلوق ابتدائے آفرینش سے مقیم ہیں۔ آپ میری کیفیت کا سوچیں تو سہی۔ ایک گہرا قدیم غار نما، رازوں بھرے دل کی مانند عمیق اندھیرا مرقد، وہاں تنہا میں اور واپسی کے ارادے کے ساتھ ہی نامانوس نسوانی آواز کا تجسس بھرا بلاوا۔

اب میرے کاندر کا پاکستانی ڈاکٹر جو دنیا گھوما تھا اور باہر پڑھا لکھا اور قیام پذیر ہو کر مصلحت پسند نہ سہی معاملہ فہم ہو گیا تھا تو وہ ایک طرف رہ گیا اور کہیں سے ایک مسلمان انڈیا نا جو نر بیدار ہو گیا۔ آواز کے تعاقب میں یہ سوچ کر کہ ع یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں۔

میں نے نظروں اور قدموں کی دونوں ہی سمت اس جانب موڑ دی جہاں سے آواز آرہی تھی۔ کچھ ہی قدم چل کر ایک موڑ مڑتے ہی کہیں اک شمع موہوم جلتی دکھائی دی جسے ایک سرسراتے ہوئے سائے نے ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ دل اب آخری تذبذب میں مبتلا تھا کہ اس طرف جانا موزوں ہے کہ نہیں۔ وار فگی اور تجسس شدید، بالآخر میری احتیاط اور خوف پر غالب آ گیا۔





قریب پہنچنے پر نظر آیا کہ وہ ایک جوان سال یہودی دوشیزہ ہے جس نے سر کے گرد سیاہ ٹشل باندھا ہوا ہے۔ یہ قدامت پسند یہودی خواتین کا حجاب سمجھ لیں۔ اس میں ان کا چہرہ اور بالوں کا کچھ حصہ کھلا رہتا ہے اور یہ اکثر عبادت کے وقت پہنا جاتا ہے۔ اس بی بی کے ساتھ ہی ایک نوجوان لڑکا بھی تھا جس نے سر پر کپاہ (یہودی مردوں کی ٹوپی) اور ان کی عبادت کے وقت پہنی جانے والی شال (تالت) اوڑھی ہوئی تھی۔



(کپاہ) (یہودی مردوں کی ٹوپی)  
لڑکا فرش پر سجدہ ریز تھا اور لڑکی کوئی اجنبی زبان میں گیت گنگارہی تھی۔ میرے کان عبرانی سے آشنا ہیں۔ آپ کے کان ذرا عربی سے آشنا ہوں تو عبرانی الفاظ کی شناخت مشکل نہیں۔ مجھے لگا کہ شاید یہ گیت آرمینی یا اکاڈین زبان ہے۔ انہوں نے میرے قدموں کی آواز

بھی سنی ہوگی اور اضافی روشنی نے انہیں اپنے علاوہ کسی اور کی موجودگی کا احساس بھی دلایا ہوگا مگر وہ میری آمد سے لا تعلق رہے۔ اس تنہا، گہرے اندھیرے اور پر اسرار ماحول میں ان کا یہ تغافل عارفانہ میرے لیے ایک سحر انگیز تاثر کا حامل تھا۔ خاتون کے گیت میں کوئی خلل نہ آیا۔ وہ بدستور قدیمی مٹی کی ایک قدیم پتھرلی دیوار کے سامنے منہ کیے گائے چلی جا رہی تھی۔

دیوار کا جائزہ لینے کی کوشش کی تو مجھے اس میں کئی دراڑیں دکھائی دیں۔ اس طرح کی بڑی بڑی دراڑوں کو یہودیوں نے قبریں بنانے کے لیے بھی ماضی قدیم میں استعمال کیا ہے لیکن وہاں کسی باقاعدہ معبد کے نشان نہ تھے۔ گیت ختم ہوتے ہی وہ لڑکا اٹھا اور اس لڑکی کے ساتھ میری موجودگی سے بے اعتنائی برتتے ہوئے نظر بچا کر جانے لگے تو میں نے یہودی شلوم دے مارا۔ لڑکی نے اسی سنجیدگی سے میرے شلوم کا جواب دیا تو میں نے جرات کر کے پوچھا کہ اس جگہ سے میں ناواقف ہوں آپ کے پاس اگر چند منٹ ہوں تو مجھے کچھ بتائیں۔

”آپ کوئی سیاح ہیں؟“ لڑکی نے شستہ انگریزی میں پوچھا

اس نے اپنے بھائی کو ٹھوکا دے کر روکا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے بولی ”میں ربیکا ہوں اور یہ میرا بھائی جیکب ہے۔ یہودی عقیدے کے مطابق یہ بارہ ثانوی درجات رکھنے والے انبیاء کا مرکز ہے۔ تاریخ اور آثار قدیمہ دونوں سے ہی یہ بات ثابت ہے کہ یہاں حاگی، مالاشی اور زکریا کی قبور ہیں۔

میں اب تک دو مزارات اس کے علاوہ بھی دیکھ چکا ہوں جن کے بارے میں حضرت زکریا کے مزار ہونے کا کہا جاتا ہے۔ نہیں وہ دوزکریا تو ہمارے اہم انبیاء major prophets میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ تیسرے زکریا ہیں۔ میں نے کسی انجان دیہاتی کی مانند سر ہلادیا اور ادھر ادھر دیکھا تو کئی چھوٹے چھوٹے مرقد مجھے مختلف راستوں سے جڑے اس زیر زمین غار میں نظر آئے۔ میں نے جرات کر کے پوچھ لیا ”کہ وہ کونسی منقبت گنگنا رہی تھی؟ میں جانتا ہوں میرا سوال بے وقوفی کا ہے اور اگر آپ کی طبع نازک پر گراں گزرے تو اس جسارت بے جا کو نظر انداز کر دیجئے گا۔“

”نہیں“ اور اس نے کہا کہ ساتھ اس کی کھلکھلاتی ہنسی کی گھنٹیاں اس ویرانے کو روشن کر کے بچنے لگیں۔ ایک سحر تھا جو سارے ماحول پر طاری کر کے اسے منور اور شادماں کر گیا۔ وہ بتانے لگی کہ ”ہم نبی مالاشی کی اولاد ہیں (مجھے شیخ نائف نے بعد میں بتایا کہ یہ اہل یہود کے ہاں نبی سمجھے جاتے ہیں، عربی میں انہیں مالانہی کہتے ہیں)“ یہ منقبت ان کی شان میں تھی۔ یہ قدیم عبرانی زبان کا گیت ہے جو اسرائیلی خواتین ان کی شان میں گنگناتی ہیں۔“

”اس کے معنی کیا ہیں؟“ میں نے اس حسن مہربان و با علم سے جاننے کے لیے فوراً ہی سوال کر لیا

”ساون آیا اور برس کے چلا گیا

فصلیں کٹ گئیں، موسم بیت گئے

اب درخت پر زیتون کے پھل جگمگاتے ہیں  
پر نبی مالاشی۔ تمہاری یاد ہے کہ میرے دل سے جاتی ہی نہیں۔“

تقدیس، تحریم، تمکنت اور یادوں سے لتھڑے اس وجودِ دلربائی کو چھوڑ کر میں بھی مرقد الانبیا سے باہر نکل آیا۔ وہ دونوں بہن بھائی  
بھی کسی اور سمت چل پڑے۔ آہستہ آہستہ جب میں جبل الزیتون سے نیچے اترتا تو وہاں ایک شاندار مزار دکھائی دیا۔

یہ حضرت عیسیٰؑ کی والدہ بی بی مریم کا مرقد عالیہ ہے۔



قرآن الکریم نے تو ایک پوری سورت نہ صرف آپ کے نام سے موسوم کی ہے بلکہ آپ کا مرتبہ اور تذکرہ اس شان و شوکت سے کیا ہے  
کہ حیرت ہوتی ہے۔ قرآن الحکیم میں آپ وہ واحد خاتون ہیں جو باقاعدہ نام سے مذکور ہیں۔ نہ حواء، نہ زلیخا، نہ فرعون کی اہلیہ آسیہ بی بی، نہ  
ہی رسول اکرم ﷺ کے گھر کی کسی خاتون کا نام سے تذکرہ ہے۔ شیخ احمد دیدات اس نکتے کو بیان کر کے عیسائی مبلغین کو چت کر دیتے  
تھے۔ کیونکہ مروجہ عقیدے کے حساب سے وہ ہمارے نبی کریم سے قریباً ساڑھے سات سو سال پہلے ہو گزری تھیں اور اگر وہ عیسائیوں



کے لیے محترم تھیں تو قرآن کو انہیں ان کے مروجہ ضوابط کے طور پر ایک دشمن خاتون شمار کرنا چاہیے تھا کیونکہ عیسائی بھی دعوت اسلام کے اور ہمارے نبی محترم کے بڑے مخالف گروپوں میں سے ایک تھے۔

وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَكَةُ يَمْرَيْمُ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلَىٰ

نِسَاءِ الْعَالَمِينَ ﴿٤٢﴾

اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم بے شک اللہ نے تجھے چُن لیا (ف ۸۷) اور خوب ستھرا کیا (ف)

(۸۸) اور آج سارے جہاں کی عورتوں سے تجھے پسند کیا (ف ۸۹)

قرآن الکریم میں سورۃ آل عمران کی آیت نمبر 42 کے حوالے سے جب فرشتے مریم کے پاس پہلی بار نوید مسیحالے کر آئے تو وہ خوف زدہ تھیں جس پر انہیں اللہ کی جانب سے یہ مرتبہ عظیم عطا کیا گیا کہ اللہ نے آپ کو منتخب کیا، پاکیزہ بنایا اور آپ کو دنیا کی تمام خواتین پر فوقیت دی۔ اس کے برعکس بائبل کی یوحنا کی دوسری کتاب کی چوتھی لائن میں وہ بھی ان کے اعلیٰ ترین کنگ جیمز ورژن میں بتایا گیا کہ حضرت مریم اپنے پڑوسیوں کے مطالبے پر (جن کے ہاں دعوت میں شراب ختم ہو گئی تھی اور وہ مہمانوں کے سامنے خفت سے بچنا چاہتے تھے ان کی درخواست تھی کہ حضرت عیسیٰ کوئی معجزہ دکھائیں اور شراب کی مقدار پوری ہو جائے) جب بی بی مریم اپنے نبی بیٹے سے معجزے کی فرمائش کرنے پہنچیں تو وہ اپنے حواریوں کے ساتھ مصروف تعلیم تھے۔ انہیں والدہ محترمہ کی دخل اندازی اس موقع پر ناگوار گزری اور انہوں نے اپنی والدہ سے کہا ”اے عورت میرا تمہارا کیا تعلق ہے؟ جان لو کہ ابھی تمہارے معاملات پر دھیان دینے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے“ دیدات صاحب کہا کرتے تھے کہ ایک نبی کو چھوڑیں کیا کوئی بھی شخص اپنی والدہ کی اپنے رفقاء کے سامنے ایسے تحقیر کرے گا۔

King James Bible

Jesus saith unto her, Woman, what have I to do with thee? mine hour is not yet come.

بائبل میں حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہو جانے کے بعد بی بی مریم کا ذکر بھی غائب ہو جاتا ہے کہ ان کا کیا بنا کیونکہ بائبل کے مطابق سیدنا عیسیٰ کے مصلوب کیے جانے کے وقت اُن کی عمر کل 33 برس تھی۔ ان کی جائے مدفن کا بھی کوئی تذکرہ نہیں۔ مصلوب ہوتے وقت بائبل کے مطابق سیدنا عیسیٰ نے اپنے حواری یوحنا (JOHN) کو اپنی والدہ کا خیال رکھنے کا کہا تھا۔ یوحنا کو بعد میں فلسطین سے علاقہ بدر کر دیا گیا تھا۔ وہ روایت کے بموجب بی بی مریم کو ساتھ لے کر شہر Ephesus جو اُن دنوں یونان کے زیر تسلط تھا وہاں جا بسے تھے۔ یہ علاقہ موجودہ زمانے میں ترکی کے شہر از میر کا قبضہ ہے۔ جہاں آپ کا چھوٹا سا مکان آج بھی زائرین مقام تحریم سمجھ کر جاتے ہیں۔

\*\*\*\*\*



مزار کا احاطہ

میں اس وقت یروشلم کے جس مرقد عالیہ میں موجود ہوں، اسے پانچویں صدی سے زیادہ مستند مانا جانے لگا۔ از میر میں بی بی مریم کی رہائش اور مرقد کے دعوے کثرت سے جھٹلائے گئے۔ اس مرقد میں جہاں میں اب موجود ہوں ایک کشادہ زینہ روڈ سے اتر کر ایک چوکور صحن میں اتر جاتا ہے۔ اب آپ ایک کلیسا میں داخل ہو جاتے ہیں جس کی ٹھیک سات سیڑھیاں اتر کر یروشلم کی ایک قدیم ملکہ Melisande کا مزار ہے۔ اس کے ساتھ ہی دو اور قبریں ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ مریم کے والدین Anne اور Joachim کی ہیں۔ ان ہی سیڑھیوں کے قدمچے سے ملحق ایک باز نطنی مرقد ہے جو ایک بڑی سی چٹان کو تراش کر بنایا گیا ہے۔



بی بی مریم کا خالی مقبرہ



اُس کا طرز تعمیر بھی ویسا ہی ہے۔ یہاں بھی روشنی بے حد مدہم ہے۔ برسوں کے دھویں نے اس کی دیواروں کو سیاہ کر دیا ہے جس سے اس کی قدامت کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ یہاں ایک کمرے میں جا بجا لٹکتے فانوس، مختلف مذہبی طغریں، تصاویر اور لٹکاوے ایک عجب منظر عقیدت باندھتے ہیں مگر مزار بالکل خالی ہے۔



یہاں کسی انسان کے دفن کیے جانے کے کوئی آثار نہیں ملے۔ اس کی وجہ سے یہ خیال بھی عام ہو گیا ہے کہ اللہ نے انہیں بھی اپنے صاحبزادے (عیسائی عقیدے کے مطابق) کی مانند براہ راست آسمانوں میں اٹھالیا۔ اس کے لیے انگریزی کی اصطلاح "Assumed" استعمال ہوتی ہے اور جو چرچ یہاں بنایا گیا ہے اسے Church of Assumption"۔ یا عربی میں کنیسیۃ السیدۃ العذراء کہا جاتا



ہے۔ مرقد میں ماحول بہت بوجھل اور دل فگار ہے۔ جا بجا آپ کو خواتین کی آہ و بکا سنائی دیتی ہے۔ ایک ماں کا درد تاریخ کے رگ و پے میں سمایا ہوا لگتا ہے۔ بیٹے کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد وہ دنیا سے بالکل ہی کنارہ کش ہو گئیں تھیں اور ہمیشہ کی عبادت گزاری میں مزید تیزی آگئی تھی۔ ساڑھی اور گریہ زاری میں ملبوس ایک خاتون نے جو بظاہر مدراسی لگتی تھی، مجھے بے مصرف اور خالی الذہن جان کر ایک شمع تھمادی تو میں نے بھی اس مرقد خالی پر سلگا کر اسے رکھ دیا۔ سر جھکایا، دعا مانگی اور چل پڑا۔



بی بی مریم کے مزار کی سیڑھیاں

کنیۃ السیدۃ العذراء (عذرا بمعنی کنواری، بی بی مریم کے نام کا عیسائی سابقہ) سے باہر نکل کر مجھے احساس ہوا کہ پہاڑیوں کے اوپر نیچے اور شہر بھر میں گھوم کر میں کچھ تھک سا گیا ہوں۔ اس طرح کی تھکاوٹ سے جلد نجات پانے کا میرے پاس ہمیشہ کا ایک آزمودہ نسخہ کافی کے چند گرم کپ ہوتے ہیں۔ چرچ سے سو میٹر دور جا کر ایک چھوٹے سے کیفے پر نظر پڑی۔ اب ہلکی ہلکی بوند باندی بھی ہو رہی تھی۔ یہاں بیٹھ کر میں اس سفر نامے کے لیے ابتدائی نوٹس بھی لکھنا چاہتا تھا۔

ایک خاموش کونے میں ابھی دوسرا کپ بمشکل ختم کیا تھا کہ میرے بیٹے کا فون آگیا۔ وہ ان دنوں آسٹریلیا میں زیر تعلیم ہے۔ اس میں بھی میری بھٹکتی روح سمائی ہے۔ سیر و سیاحت کا دلدادہ ہے۔ جانا چاہتا تھا کہ میرے سفر کے تجربات کیا ہیں۔ ہم کوئی پندرہ منٹ تک اردو میں محو گفتگو رہے۔

ہم باپ بیٹے کی گفتگو کے دوران مجھے لگا کہ میں مسلسل ایک ادھیڑ عمر کے ایک عرب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہوں۔ اس کی اس دیدہ دلیری سے بچنے کے لیے میں نے پشت اس کی جانب کر لی تاکہ وہ میرے چہرے کے تاثرات نہ پڑھ سکے۔ فون بند کر کے بمشکل تیسرا کپ اس

ارادے سے بھرا ہی تھا کہ اپنے نوٹس قلمبند کرنا شروع کروں کہ ایک گرج دار آواز میں ”السلام علیکم اور ہیلو میرا نام عبدالقادر ہے“ مجھے سنائی دیا۔ نگاہیں اٹھانے پر ایک سیدھا ہاتھ میرے سامنے مصافحے کے لیے دراز تھا۔ اسی ادھیڑ عمر کے عرب عبدالقادر کا ہاتھ، جو مجھے کافی دیر سے وہاں بیٹھا تک رہا تھا۔ قدرے ہچکچاہٹ سے میں نے بھی دست مصافحہ دراز کیا اور اپنا نام بتایا۔ اس کے چہرے پر روشنی پھیلی اور پوچھنے لگا کہ ”کیا میں مسلمان ہوں؟“ مجھے یہ زبان جو تم بول رہے تھے بہت اچھی لگی۔ میں نے جان چھڑانے کے لیے بتایا کہ ”اس زبان کا نام ہے ”اردو“۔

اردو کا نام سن کر اس کے چہرے پر گہری سوچ کے سائے منڈلانے لگے جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ لفظ ”اردو“ اس دوران اس کے لبوں سے کئی مرتبہ ادا ہوا۔ اچانک بے یقینی اور تذبذب کے وہ سائے چھٹ گئے۔ چہرے پر ایک نئی روشنی طلوع ہوئی اور وہ کہنے لگا ”کیا یہ وہ زبان نہیں جسے پاکستانی بولتے ہیں؟“

میں نے بھی اثبات میں سر ہلادیا۔ ”کیا آپ پاکستانی ہیں؟“ یہ اس کا اگلا سوال تھا۔ اب اس کی خوشی دیدنی تھی۔ پاکستان کا نام فضا میں بلند ہوتے ہی میں اب اس مسرت کا پیشگی اندازہ لگا لیتا ہوں جو فلسطینی عربوں کے وجود پر طاری ہو جاتی ہے۔ وہ جھک کر عرب رسم کے مطابق میرے گال کا بوسہ لینے لگا۔ ”واللہ سنا بہت تھا مگر تم پہلے پاکستانی ہو جس کا دیدار مجھے نصیب ہوا ہے۔“

اس کی وارفتگی اور والہانہ اظہار دیکھ کر مجھے گمان گزرا کہ میں نیزی سے معدوم ہوتی جنگلی حیات کی کوئی نسل ہوں اور وہ مردوں کی جین گڈال ہے (جن کا چمپینزیوں پر بڑا تحقیقی کام ہے) یہ مجھ پر زبردستی مسلط کی گئی ملاقات سچ پوچھو تو میرے لیے سرمایہ افتخار ہے اور تادم تحریر جاری ہے۔ اسرائیل میں وہی میرا معاون، سفری رہنما اور بہترین دوست ثابت ہوا۔

اس کی ایک چھوٹی سی ٹریول ایجنسی تھی جس میں اس کے کاروباری معاونین اس کے چار بیٹے اور تین عدد داماد بھی تھے۔ مسلمان ہونے کے ناطے اُسے اس کاروبار کو کرنے کے لیے اسرائیل نے بطور ٹور آپریٹر کوئی لائسنس جاری نہیں کیا تھا۔ وہ بھی ہار ماننے والی روح نہ تھا۔ دھڑلے سے اپنا کاروبار چلا رہا تھا۔ اسے جب یہ علم ہوا کہ میں اسرائیل میں مزید ایک ہفتے قیام کروں گا تو اس نے مجھ سے پوچھ لیا کہ میری سفری ترجیحات کیا ہیں؟

میں نے ایک تاسف سے کہا کہ یہاں اسرائیل میں مسلمانوں کے لیے دیکھنے کو اتنا کچھ ہے کہ ایک ماہ بھی ناکافی ہو گا مگر اس کے باوجود حضرت موسیٰ کا مرقد، ہیبرون، بیت اللحم، بحیرہ مردار (Dead Sea) حضرت لوط کی برباد بستیوں، صدم اور گم راہ (h Sodom and Gomorra) کی باقیات، قمران کے غار اور جیریکو۔

میری سیاحت کی فہرست خواہشات کو اس نے بہت اطمینان سے سنا اور سگریٹ کے ایک لمبے سے کش سے دھواں چھوڑتے ہوئے کہا کہ ”یہ تو کوئی خاص مشکل نہیں۔ یہ سب ایک ہفتے میں آسانی اور جی کھول کر ہو جائے گا۔“ ”اچھا“ اس کی یقین دہانی پر میرا دل کھل اٹھا۔ مگر ایک کنجوس پنڈی وال کی رگ کفایت شعاری بھی پھڑک اٹھی اور میرے شوق سیاحت کا ہاتھ تھام کر ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ میں نے بھی بلاتامل پوچھ لیا کہ اس کا کل معاوضہ کیا لو گے۔ میں اپنا ہوم ورک اس حوالے سے کر کے نکلا تھا۔ پٹرول اسرائیل میں 180

روپے فی لیٹر ہے۔ ایک آرام دہ ٹیکسی کا پورے دن کا معاوضہ کسی طور بھی 330 سے 350 امریکی ڈالر سے کم نہیں ہوتا۔ میں منتظر تھا کہ وہ کیا اجرت کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کی اجرت کی طلبی میں ہی اس کے کچھ دیر پہلے ظاہر کیے ہوئے جذبات کی پرکھ ہو جائے گی۔

”میرے بھائی اسرائیل میں مسافت آسان نہیں یہودی ڈرائیور ہو تو مسلمان علاقوں یعنی بیت اللحم، حیریکو اور ہیبرون میں جانے سے ہچکچائے گا۔ مسلمان ڈرائیور کے لیے ان کے A ”علاقوں میں داخل ہونے پر پابندی ہوگی۔

میں اُس کی اس وضاحت پر جھلا کر پوچھ بیٹھا کہ ”اس مسئلے کا آخر حل کیا ہے؟“

”ارے حل تو آپ کے سامنے ہی بیٹھا ہے۔ پریشان کیوں ہو گئے۔ میں اسرائیلی عرب ہوں۔ مجھ پر یہ سفری پابندیاں لاگو نہیں۔ میرے پاس شناختی کارڈ ہے۔ میری کار پر بھی تل ابیب کی نمبر پلیٹ ہے۔“ عبدالقادر نے سارا مسئلہ ہی چٹکیوں میں بلکہ سگریٹ کے دھوئیں میں اڑا دیا۔ میں نے سوچا کہ عبدالقادر فلسطین والے کے راگ درباری کا یہ طویل الاپ شاید مجھ سے زیادہ پیسے بٹورنے کا آزمودہ سیاحتی چمت کار ہے۔ سیر و سیاحت کے شوقین جانتے ہیں کہ یہ سارا کھڑاگ ریشم کے کیڑے کے تار بانی کا عمل ہے مگر اس میں ریشم کا کیڑا سیاح ہوتا ہے جسے خوش اخلاقی اور غیر معمولی دل چسپی کے اظہار میں پلیٹ کر مار دیا جاتا ہے۔ یہ یقیناً مجھ سے ٹکا کے اجرت مانگے گا۔ میں نے ایک دفعہ پھر سے اجرت کا سوال دہرایا تو اس نے شفقت سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”یہ بتاؤ کل کہاں اور کب جاؤ گے؟ معاوضے ہم بعد میں طے کریں گے“ برسوں کی سیاحت گردی نے مجھے اس طرح کی کھلوڑ سے کنارہ کھینچنے کا سبق سکھایا ہے۔ اس سے بعد میں بہت بد مزگی ہوتی ہے۔

پہلی دفعہ دل کے ماہر نے دل کا مشورہ مانا۔ اپنی احتیاط کو بالائے طاق رکھا اور حضرت موسیٰ کے مرقد عالیہ کی طرف جانے کا قصد ظاہر کیا۔

اس نے خوش دلی سے اثبات میں سر ہلایا۔ میری جائے قیام پوچھی اور کل آٹھ بجے صبح لینے آنے کا وعدہ کر کے وہ چلا گیا۔ میں نے اپنے نوٹ مکمل کیے ایک عدد کافی اور بکلاوا کھایا اور جب بل دینے کاؤنٹر پر پہنچا تو وہاں موجود بڑی بی نے کہا وہ تو عبدالقادر نے ادا کر دیا ہے۔

چالا کو کہیں کا۔ مجھے مکمل طریقے سے اپنے دام الفت میں پھانس کر لوٹنا چاہتا ہے۔ دل میں اس بے رحم شیطانی وسوسے نے چھلا نکلیں مارنا شروع کر دیا۔

\*\*\*\*\*





صحرائے-یہودا-میں-بدو-بستی۔

میرے سفری رہنما عبدالقادر حسب وعدہ ٹھیک آٹھ بجے مجھے لینے ہوٹل پہنچ گئے اور ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مرقد عالیہ کی زیارت کے لیے چل پڑے۔ ایک دھیمی رفتار سے کار صحرائے یہودا Judean Desert سے گزر رہی تھی۔ یہ مرقد یروشلم مشرق کی جانب سے شروع ہونے والے صحرائے یہودا میں بیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ پندرہ ہزار مربع کلومیٹر پر محیط یہ صحرا دنیا کا سب سے مختصر صحرا ہے۔ لیکن اس کی ریت کے رنگ، اس کے ٹیلوں کی اونچ نیچ، اس کے نخلستانوں کی تسکین بخش ٹھنڈک نے اس ارض مقدس کی طویل تاریخ کو بڑے تحمل اور رازداری سے دیکھا ہے۔ اس کی زمین میں سختی اس کی ہواؤں میں بے رحم حدت اور اس میں روئیدگی کے فقدان کے باوجود یہ صدیوں سے ایک طرف تو سیاسی باغیوں اور مذہبی انتہا پسندوں کے لیے ان تھک میدان کارزار بنا رہا ہے تو یہ ایسا بے مروت بھی نہیں کہ اس کے دامن میں دنیا سے کنارہ کش روحانی مراتب کے متلاشی اہلیان حق کو سایہ عاطفت نصیب نہ ہوا ہو۔



دریائے اردن کا مقام۔ بتپسمہ

ہمارے نبی حضرت یحییٰ علیہ السلام اسی صحرا میں خاک برپا، تلاش حق میں سرگرداں رہے۔ اسی سرزمین پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی مراقبہ کے لیے آتے رہے تو یہیں پر حضرت داؤد علیہ السلام کی افواج نے جیسبس (عربی یوس) کی ایک چھوٹی سی بستی کو حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے ایک ہزار سال پہلے فتح کیا تھا اور شہر کا نام گہوارہ امن یعنی یروشلم رکھا تھا۔ دریائے اردن اس کے ایک طرف چھپتا چھپاتا بہتا بہتا بصد ندامت بحیرہ مردار میں جا گرتا ہے۔ ارے یہ وہی دریائے اردن ہے جہاں عیسائی عقیدے کے مطابق بائبل کے ایک مصنف اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام یوحنا John نے حضرت عیسیٰ کو غسل تقدس و پاکیزگی یعنی پیتسمہ دیا تھا جس سے ان کے روحانی مدارج اس قدر بلند ہو گئے تھے کہ یوحنا کو آسمانوں سے آتی ایک آواز سنائی دی کہ یہ (نعوذ باللہ) فرزند الہی ہیں۔ آپ یہ نہ بھولے گا کہ یوحنا کا خود کا درجہ بارہ حواریوں میں سے محض ایک حواری کا ہے۔ اسی لیے موصوف کا بڑا مقام ہے۔ انہیں John-the Baptist یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ عیسائیوں کی نئی بائبل (NEW TESTAMENT) جو ان کے ایک بڑا فرقہ پر وٹسٹنٹ جسے ان کے خوارج سمجھ لیں اور جن کا بڑا کلیسا، چرچ آف انگلینڈ ہے کلیسائے روم نہیں (اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے چار حواریوں مارکس، متی، لوقا اور یوحنا کے حوالے سے ترتیب دی گئی ہے۔ اس لیے اس کے آغاز میں ہی چاروں کے نام سے پہلے وضاحتی عبارت The Gospel According to Mark, Mathew, John or Lucas کا سرنامہ درج ہوتا ہے۔ اس میں لفظ According کو سامنے رکھ کر تحریف اور ذاتیات کی گنجائش رکھیں۔

ایک زمانے تک فلسطینی مسلمان حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مزار کی زیارت کی خاطر ایک جلوس کی صورت میں بطور ایک تہوار مناتے تھے۔ اس تہوار کی رسم کرد سپہ سالار سلطان صلاح الدین ایوبی کی بیت المقدس کی فتوحات سے پڑی۔

صحرائے یہودا کے ہی ایک کونے میں جیرکو (Jericho) ہے۔ اس شہر کو بھی دمشق کی مانند دنیا کا قدیم ترین شہر کہلانے پر اصرار ہے۔ روایات اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے بھی نو ہزار سال قبل سے آباد ظاہر کرتی ہیں۔ ایک مقام پر ہمیں عرب بدوؤں کی کچھ چھوٹی بستیوں دکھائی دیں۔ عربوں میں ان سے بہتر ”منصف“ کوئی نہیں بناتا۔ یہ تو آپ کو یاد ہی ہوگا کہ منصف ہم نے نبیل انصاری کے گھر پر کھائی تھی۔ یہ عرب پلاؤ کی ایک قسم ہے۔ جسے بکری کے دودھ کی دہی کی خمیر بنا کر اس میں گوشت کو ہلکے مصالحے لگا کر چند گھنٹوں کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے پھر اسے چاولوں پر زعفران، کاجو، پستے کے ساتھ پھیلا دیا جاتا ہے۔ ہمیں کسی دن کسی بدو کے خیمے میں بیٹھ کر صحرائے شام کی لطف اٹھاتے ہوئے منصف کھانے یہاں آنا چاہیے، کار کے شیشے سے میری نگاہ اس صحرائے وسعتوں اور بے آب و گیاه ریت کا جائزہ لینے لگ جاتی ہے۔ ایک بدو چرواہا اپنی بھیڑوں کو آہستگی سے ہانکتا ہوا لے جا رہا۔ ذرا دور ایک اونٹ سڑک پر کسی ناکام عاشق کی مانند دنیا سے لاتعلق بیٹھا تھا گویا وہ ان اسرائیلی ٹینکوں کو جتلا رہا ہو کہ ع پہلے ہی بہت ناشاد ہیں ہم، تو اور ہمیں ناشاد نہ کر۔ یہ ٹینک اس سے ذرا فاصلے پر موجود تھے۔ یہ علاقہ اکثر سیاسی بھونچال کا سبب بن جاتا ہے۔ یوں اب یہ ہائی سیکورٹی زون میں شمار ہوتا ہے۔

ایک زمانے تک فلسطینی مسلمان حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مزار کی زیارت کی خاطر ایک جلوس کی صورت میں بطور ایک تہوار مناتے تھے۔ اس تہوار کی رسم کرد سپہ سالار سلطان صلاح الدین ایوبی کی بیت المقدس کی فتوحات سے پڑی۔ آپ اسے جلوس فتح مندی مان لیں۔ سارے فلسطین سے مسلمان ایسٹر سے ایک ہفتہ پہلے جمعہ کو یہاں دھوم دھڑاکے سے جھنڈے لہراتے، حربی ترانے (جنہیں رجز کہتے ہیں) گاتے اور جشن مناتے ہوئے یہاں آ جاتے تھے۔ جشن کا دورانیہ ایک ہفتے کا ہوتا تھا۔ ان زائرین وارفہ کے قیام اور طعام کا ذمہ مرقد عالیہ پر حرم الشریف والے وقف کے ذمے ہوتا تھا۔

یہ لطف و کرم 1920 کی پوری دہائی تک جاری رہا مگر پھر یوں ہوا کہ زائرین کا یہ اجتماع برطانوی تسلط کے خلاف احتجاجی مظاہرے اور دھرنے کا روپ اختیار کر گیا۔ سلطنت برطانیہ نے اس پر پابندی لگا دی۔ ان کے ملک چھوڑ جانے پر اس کا پھر سے آغاز ہو گیا مگر چند سال کے امن افروز اجتماع کے بعد یہ ایک مرتبہ پھر سے میدان کارزار بن گیا کئی عرب اور یہودی ہلاک ہو گئے۔ 1967ء میں جب فلسطین پر اسرائیل کا قبضہ ہو گیا تو اس اجتماع پر پابندی سن 1997 تک جاری رہی۔ تب سے اسے منانے کی دوبارہ اجازت ہے لیکن اب اس کا وہ دھوم دھڑاکا نہیں، ہر شے بجھی بجھی اور دھیمی دھیمی ہو گئی ہے۔





سیدنا موسیٰ کا مزار

آج بھی اپریل کا مہینہ ہے ایسٹر میں ابھی ایک ہفتہ باقی ہے۔ ہم موسیٰ کلیم اللہ کے مزار کی جانب اس سڑک پر رواں دواں ہیں جو یروشلم سے جیر کو جاتی ہے۔ یہی روڈ آگے بڑھ کر مکہ المکرمہ تک جاتی ہے۔ حجاج زمینی راستے سے اسی سڑک کو استعمال کرتے تھے۔ عبدالقادر نے جب تیزی سے بائیں جانب موڑا تو سامنے ایک مدہم سرخ رنگت کی مٹیالی پہاڑی دکھائی دی۔ جس سے متصل حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مزار تھا۔



سیدنا موسیٰ کے مزار کی تختی

ایک حدیث مبارکہ کی رو سے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ قدس شریف کے نزدیک ایک شاہراہ کے کنارے ایک سرخ پہاڑی کے دامن میں میرے بھائی نبی موسیٰ کی قبر ہے۔ میں اگر وہاں ہوتا تو تمہیں اس جگہ لے جاتا۔ ”عیسائی اور یہودی اس مرقد کے نبی موسیٰ کی جائے تدفین ہونے کا دعوے کو درست نہیں مانتے۔

وہ دریائے اردن کے مغربی کنارے پر کوہ نیبو کے دامن میں ان کے مدفن کو مستند مانتے ہیں۔ میرا معاملہ مختلف ہے ساری دنیا کے یہودی اور عیسائی اپنے اس دعوے میں اکٹھے ہو جائیں تب بھی میں تو بات اپنے نبی ﷺ کی ہی مانوں گا۔ سوچئے تو سہی کہ آج سے پندرہ سو سال پہلے وہ خاتم الانبیاء، سید المرسلین شاہراہ کے کنارے ایک سرخ پہاڑی کے دامن میں مرقد عالیہ کی نشانی بتا رہے ہیں اور وہ سو فیصد اپنے محل وقوع پر پوری اترتی ہے۔

کنکروں سے اٹی ہوئی ایک چھوٹی سی سڑک پر آن کر ہم پارکنگ ایریا میں آگئے ہیں۔ یہاں بھی دنیا بھر کے مزارات کی مانند زائرین کی جیب خالی کرنے کے لیے کئی کیبن ہیں جن میں مقدس نمونے برائے فروخت ہیں۔ مشروبات کے بھی اسٹال ہیں۔ ایک بس سیاحوں کا گروپ لے کر آن پہنچی ہے۔ کاروباری فائدے کی امید میں ایک بدو بھی اپنا سبیل بانکاہری سرخ ربن اور بے حد خوبصورت بنی ہوئی مہار والا اونٹ لے آیا ہے۔ سارا احاطہ غور سے دیکھیں تو بہت قدیم دکھائی دیتا ہے۔ ایک اونچے مینار اور چھوٹے چھوٹے کئی گنبد ہیں۔

عبدالقادر مجھے عین اس دروازے پر لے جاتا ہے جس ہر مملوک حکمران کا یہ کتبہ نصب ہے کہ ”اس مقام عالی کی تعمیر موسیٰ کلیم اللہ کے مدفن پر سلطان ظاہر عبدالفتح بیبار کے حکم پر سن 668 ہجری میں کی گئی۔“





سیدنا موسیٰ کے مزار کا تعویذ اصل مقبرہ اس کے نیچے ہے

اس مقام کی قدامت اور تاریخی اہمیت کا احساس آپ کو اندر داخل ہوتے ہی ہونے لگتا ہے۔ ایک انجانی سی کشش، ایک احساس تقدیس۔ بالکل ویسا ہی جیسا کہ اللہ کے ایک برگزیدہ نبی کے آستانہ آخر کا ہونا چاہیے۔ مرکزی احاطے میں کئی عرب خانوادے موجود تھے۔ قدیم روایات کے جدید امین۔ جابجا چولہے جل رہے تھے جن پر انواع و اقسام کے کھانے پک رہے تھے۔ وہ وقف جو یہ سب انتظام ان زائرین کے لیے ماضی میں کیا کرتا تھا۔

وہ اب بکھر چکا ہے۔ ایک پرانے بڑے درخت کے نیچے کئی بزرگ خواتین قرآن الکریم کی تلاوت کرنے میں مصروف تھیں۔ ایک نوجوان لڑکی کھانا بنا رہی تھی کچھ مرد حضرات یا تو نوافل پڑھ رہے تھے یا گپ شپ کر رہے تھے۔ ہم بائیں جانب مڑ کر جب مسجد کے ساتھ ہی ایک کمرے میں داخل ہوئے تو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا مرقد عالی دکھائی دیا۔ جنگلہ تھام کر وہاں بیٹھے کئی زائرین کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ ہم نے بھی انکساری سے فاتحہ پڑھی اور کچھ دور ہو کر ایک کونے میں جا بیٹھے۔ عبدالقادر قرآن الکریم اٹھا کر پڑھنے

لگا۔ میں نے دیکھا کہ چیونٹیوں کی ایک لمبی قطار اس مرقد کے چاروں طرف مسلسل ایک ستون پر چکر لگا رہی گویا کسی قسم کا طواف کر رہی ہو۔ ایک بڑی بی نے کمال شفقت سے مجھے اور عبدالقادر کو پہلے مٹھائی اور بعد میں ساتھ کھانے کی دعوت دی۔ چند منٹوں کے بعد قادر اچانک کھڑا ہو گیا اور اعلان کیا کہ اب ہم یہاں سے رخصت ہوں گے۔ میں نے احتجاج کیا کہ یہاں میرا کچھ دیر اور ٹہرنے کا ارادہ ہے۔ اس نے خاموشی سے مجھے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور خود تیز تیز باہر کی جانب پارکنگ کی طرف چلنے لگا۔ میں نے اس سے پوچھ لیا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ ”تم عبدالقادر کے ساتھ ہو جو اس سرزمین کا سب سے پرانا سفری رہنما ہے۔ میرے مشورے کبھی غلط نہیں ہو سکتے۔ جلدی سے کار میں بیٹھو اور چل پڑو۔ میں سر نیوٹرا کر بادل ناخواستہ سوار ہوا۔ اس نے گاڑی ریورس کی اور صحرائے یہودا میں ایک میل مزید جانے پر ایک چھوٹے سے شکستہ مزار کے خدو خال افق پر نمودار ہونے لگے۔ اس کی پشت پر مجھے ایک چھوٹا سا گاؤں بھی دور ہی سے دکھائی دینے لگا۔ اس کے مکانات کی چھتیں مٹی کی اور دروازے ٹین کی تھے۔ سامنے کا یہ منظر دیکھ کر جب میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا تو وہ بتانے لگا کہ ”یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چرواہے تھے اس گاؤں کا نام بھی نبی موسیٰ ہے۔ میں نے بغور جائزہ لیا تو پورا گاؤں بمشکل پچاس کے قریب گھروں پر مشتمل تھا۔ جس کے در و دیوار اور ماحول پر غربت کے دکھ بھرے سائے منڈلا رہے تھے۔ ”کیا ہم واپس اسی مزار پر نہیں جاسکتے؟“ میں مصر تھا۔ وہ میرے سوال کو نظر انداز کر کے گاڑی سے اتر کر گاؤں میں داخل ہو گیا۔ ایک چھوٹے سے گھر کے باہر رک کر اس نے ٹین کے دروازے پر دستک دی۔ ایک شخص باہر نکلا کر آیا اور اس سے بڑی گرمجوشی سے معانقہ کیا۔ اس کے بعد وہ میری جانب بھی اسی خلوص اور والہانہ انداز میں بڑھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہم دونوں کے ہاتھ تھام لیے اور زبردستی ہمیں گھر کے اندر لے جانے لگا۔ گھر کے اس کمرے میں چھوٹے سے غالیچے فرش پر دراز تھے، درمیان ایک کوتاہ قد میز بالکل وسط میں رکھی ہوئی تھی۔ ہمیں وہ وہاں چھوڑ کر اندر کہیں چلا گیا۔ ”عبدالقادر یہ کیا تماشا ہے؟“ مجھے اب غصہ آنے لگا۔

”یہ امین الحسین ہیں۔“ قادر نے میرے اشتعال بھرے انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے جواب دیا۔

”تو؟“ میری ناراضی کسی طور کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ”یہ اس مزار کے متولی ہیں۔ سلطنت عثمانیہ کے مقامی حکمران نے سن 1800 کے آغاز میں اس مزار کا انتظام و انصرام اس خاندان کے حوالے کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اس گھرانے کا شمار فلسطین کے سب سے متمول اور باعزت گھرانوں میں ہوتا تھا۔ ان کے پرداد ایر و شلم کے میئر تھے۔ اب ان کا حال ابتر ہے۔“ عین اسی لمحے وہ میزبان عربی کافی کی پیالیوں کی ٹرے اٹھائے اندر آ گیا اور قادر سے عربی میں گفتگو کرنے لگا۔ میں نے ان کے مکالموں کی سن گن لینے کی کوشش کی تو لفظ پاکستان اور دکتور کے الفاظ بکثرت سنائی دیے۔ کچھ دیر بعد قادر کی آنکھوں میں ایک فاتحانہ چمک دکھائی دی اور امین الحسینی ہمارے ساتھ چل پڑے۔ صحرائے یہودا کے اس کنارے پر نبی موسیٰ کے چھوٹے سے گاؤں میں جب سورج سوانیزے پر محسوس ہو رہا تھا عبدالقادر نے کہا ”یہ ہم کو نبی موسیٰ علیہ السلام کی اصل قبر تک لے جائیں گے جو اسی احاطے میں ایک تہہ خانے میں ہے۔“

\*\*\*\*\*

ہم تینوں جب کار سے اتر کر حضرت موسیٰ کے مزار میں داخل ہوئے تو وہاں موجود لوگ مزار کے متولی کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ یہ احترام بڑا پروقا تھا، اس میں شرف انسانی کا بڑا لحاظ رکھا گیا تھا۔ میرے دماغ میں پاکستان کے ایسے مواقع پر دیکھے گئے مناظر آ گئے جہاں درگاہوں اور خانقاہوں پر آنے والے پیر زادوں اور سجادہ نشینوں کی آمد پر غلامانہ، گرواٹ بھری اور غیر انسانی لگاؤ کے مظاہرے مریدین، معتقدین اور حاضرین بے دام میں عام دکھائی دیتے ہیں۔ نہ کسی نے آگے بڑھ کر ہاتھ چومے، نہ دامن تھاما، نہ قدم بوسی کی۔ پاکستان میں ان نام نہاد پیروں، اولیاء زادوں کے طرز ہائے زندگی شاہانہ ہیں، وسیع جاگیریں، دولت کے انبار اور انتہائی شرمناک غیر اخلاقی زندگی۔ اگر آپ ان کو قریب سے جانتے ہیں۔

اس بچارے امین الحسینی کا جس کے پردادایر و شلم کے میسر اس وقت رہے ہیں جب ہمارے مخدوم اور پیر زادوں کو شاید سونے کے لیے صحیح قسم کی چار پائیاں اور پاؤں کے لیے ثابت جوتیاں بھی نصیب نہ ہوتی ہوں۔ ان کا اس قدر عظیم مزار کا متولی ہونا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس بے چارے امین الحسینی کا گھر تو ایک سو بیس میٹر پر گارے مٹی کی دیواروں کا بنا تھا۔ جس میں ٹین کے دروازے تھے، بغیر فرنیچر، چھوٹے سے فرش مہمان خانے والا جس میں کوئی مرید خدمت بجالانے کے لیے بھی مامور نہ تھا۔ وہ خود ہی قہوے کی ٹرے اٹھائے چلے آئے تھے۔ خالی کپ بھی خود ہی لے گئے تھے۔ ان کا ثوب بھی استری سے عاری مگر صاف ستھرا تھا۔ ان کے پیروں کے سینڈلوں میں تمے یا پٹیاں نہ تھیں۔

کمرے کے انتہائی بائیں جانب حضرت موسیٰ کلیم اللہ کا ناپختہ مرقد مبارک تھا۔ اس کے اوپر سرخ مٹی پڑی تھی اور یہ زمین سے بمشکل چھ انچ بلند تھا۔ چند کنکر بھی اس مزار پر پڑے تھے۔ لوح مزار خاصی قدیم تھی جس پر سیاہ حروف میں عربی زبان میں ”نبی موسیٰ کلیم اللہ“ لکھا تھا۔

احاطہ مزار میں داخل ہوتے ہی عبدالقادر مجھے ایک کونے میں لے کر بیٹھ گیا۔ امین الحسینی سے معتقدین آکر ملتے رہے۔ وہ بھی خوش دلی اور عجز کا پیکر بنے رہے۔ کوئی جعلی بھرم یا بلاوجہ تحریم و تقدیس کا خول ان کے پورے وجود پر مسلط نہ تھا۔ وہ ان میں سے ہی ایک تھے نہ کہ کوئی مخلوق غیر معمولی۔ کچھ دیر بعد جب وہ وہاں موجود پندرہ بیس افراد سے مل چکے تو بہت نرم لہجے میں معذرت بھرے انداز میں عربی میں جانے کیا کہا کہ وہاں سے بلاچوں و چراسب ہی کھسک لیے۔ انہوں نے کھڑکیوں پر پردے گرا کر اپنے ثوب کی جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا۔ ہمیں ساتھ لے کر وہ ایک چھوٹے سے ملحقہ کمرے میں داخل ہو گئے۔ اس کمرے کی دائیں ہاتھ والی دیوار پر لکڑی کا ایک پرانا سادہ روزہ تھا۔ بالکل ویسا ہی جیسا کبھی آپ کو اندرون موچی گیٹ قدیم لاہور یا غالب کے دہلی والے محلے بلی ماراں (بلی ماراں بمعنی Shuttering کا کام کرنے والے) کے پرانے مکانوں میں دکھائی دیتے تھے۔ اس دروازے کے نقش و نگار بہت اچھے اور نازک



تھے۔ اس پر لگے تالے کو انہوں نے ایک عجیب سی کنجی سے کھولا۔ دروازے کے دوسری جانب مکمل اندھیرا تھا۔ وہ اس اندھیرے سے آشنا تھے لہذا بلا تکلف آگے بڑھ گئے۔ ہم رکے رہے تو انہوں نے پیچھے پیچھے آنے کا مشورہ دیا۔ یا اللہ تیری یہ کیسی عنایت ہے۔ مجھ پر کیا راز ہائے فسوں عیاں ہو رہے ہیں، میرا دل دھڑک رہا ہے ایسا لگتا ہے کہ اُچھل کر باہر آ جائے گا۔



وہ زینہ جو تہہ خانے میں مقبرہ کی جانب جاتا ہے

اس کمرے کے دروازے سے ذرا پرے ایک قدیم زینہ تھا جو بہت خاموشی سے کسی دھیمی آبخار کی مانند ایک تہہ خانے میں اتر رہا تھا۔ اب میری آنکھوں کو اندھیرے میں کچھ کچھ نظر آ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہم تاریخ کے کسی انجانے اندھیرے غار میں اتر گئے ہیں۔ کل چودہ زینے تھے۔ اس زینے کے ختم ہوتے ہی ایک موٹی سی دیوار میں نصب ایک اور دروازہ تھا۔ بے حد چھوٹا سا دروازہ۔



مرقد عالیہ میں داخلے کا تنگ راستہ  
اتنا چھوٹا کہ میں گھٹنوں کے بل ہی ریگ کر دوسری طرف جاسکتا تھا۔ اس مرحلے سے فارغ ہو کر جائزہ لیا تو یہ بارہ فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا ایک کمرہ تھا۔ جس کا فرش مٹی کا اور جس میں کوئی کھڑکی نہ تھی۔ اس کی چھت بھی کچھ اونچی نہ تھی مگر ایک بات کی بڑی حیرت ہوئی۔ عام طور پر ایسی جگہوں پر جو اندھیری، بے درپچہ اور بند رہنے والی ہوں ایک عجیب سی بو ہوتی ہے یہاں معاملہ اس کے برعکس تھا۔

بے حد ہوادار اور تازہ تازہ بالکل ویسا ہی ماحول جیسا باہر کی کھلی ہوا میں تھا۔ باہر کی ہوا میں اور یہاں اندر ایک واضح فرق تھا۔ یہاں ایسا لگتا تھا جیسے من بھر مشک تاتار اور کئی من گلاب کو ملا کر پیچم کوئی اسپرے کیا جا رہا ہو۔ اس خوشبو کے بہاؤ میں ایک تقدیس، ایک دھیمپن، ایک ٹھہراؤ تھا۔ وقت اپنا دامن سمیٹ کر یہاں ایک طرف سر جھکا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر لمحے اس عجیب طاق عقیدت کو تھام کر رک سے گئے تھے۔

کمرے کے انتہائی بائیں جانب حضرت موسیٰ کلیم اللہ کا ناپختہ مرقد مبارک تھا۔ اس کے اوپر سرخ مٹی پڑی تھی اور یہ زمین سے بمشکل چھ انچ بلند تھا۔ چند کنکر بھی اس مزار پر پڑے تھے۔ لوح مزار خاصی قدیم تھی جس پر سیاہ حروف میں عربی زبان میں ”نبی موسیٰ کلیم اللہ“ لکھا تھا۔ میرے معزز قارئین کے لیے یہ اندازہ لگانا شاید مشکل نہ ہو کہ صحرائے یہود کے اس سرخ پہاڑی کے دامن میں اس مرقد عالیہ کے پاس موجود ہونا کس قدر بہ لحاظ روحانی وزنی اور بہ لحاظ تقدیس بوجھل لمحہ تھا۔ موسیٰ کو اللہ سے کلام کی سعادت کئی مرتبہ ملی۔ قرآن الحکیم میں سب سے زیادہ آپ ہی کا مجموعی طور پر 136 مرتبہ ذکر ملتا ہے۔ جو تعداد کے لحاظ سے کسی بھی نبی سے زیادہ ہے۔ گو اس پورے ذکر سمیت دیگر انبیاء اور واقعات کا مخاطب بغرض پیغام و تربیت ہمارے نبی محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات اقدس ہے۔ یہ فرق اس لیے بھی بتانا لازم ہے کہ نبی محترم کا قرآن پاک میں نام کل چار مرتبہ آیا ہے۔ قرآن بیشتر مقامات پر ہمارے نبی کریم ﷺ سے Second Person کے طور پر خطاب کرتا ہے۔ اس صیغہ کلام میں مخاطب کا نام لینا لازم نہیں ہوتا۔ حضرت موسیٰ کو اللہ نے ایک ایسا مقام فخر عطا کیا ہے کہ آپ نے تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ ان سے منسوب معجزات بھی عجیب ہیں اور ان کے مخالفین جو دراصل اللہ کی مخالفت پر اترے تھے یعنی فراعنہ مصر سے زیادہ کسی کی نشانیاں دنیا میں بطور اسباق عبرت اس قدر احتیاط سے محفوظ نہیں۔

میں حضرت موسیٰ کو باآواز بلند سلام پیش کرنے کے بعد مٹی کے فرش پر ہی براجمان ہو گیا اور ایک تواتر سے اس مرقد محترم کا جائزہ لینے لگا۔ امین صاحب کہنے لگے کہ جب ہمارے نبی محترم ﷺ مکہ سے یروشلم آنے کے لیے یہاں پہنچے تو آپ نے حضرت موسیٰ کو اپنے عین اس مقام مرقد میں صلوٰۃ کی ادائیگی میں مصروف دیکھا۔ اس مزار پر انوار سے روشنی کی شعاعیں بلند ہو رہی تھیں۔ میں ایک ایسی کیفیت سرور میں تھا جو خوابیدگی اور پیناٹرم کا درمیانی فسون تھی۔ بہت خاموشی سے میں یہ بیانیہ سنتا رہا۔ یہ وہ لمحات ہوتے ہیں جب آپ کے دماغ میں خیالات کے کئی چشمے ساتھ بہہ رہے ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود ارد گرد گھومتی کائنات کسی ایک مرحلے پر ایک نقطہ اجتماع پر ٹھہری ہوتی ہے۔ میری ہمت نہ پڑی کہ میں اس جگہ کی تصویر کشی کروں۔ یہ حرکت کم از کم میرے نزدیک ایک طرح کی اس مقام تقدیس کی تحقیر ہوتی۔ بیس منٹ وہاں مراقبہ کرنے کے بعد امین صاحب ہمیں دوبارہ پہلی منزل پر لے گئے۔ یہ مزار کا بڑا سا احاطہ ہے یہاں قریباً ایک سو بیس کمرے ہیں۔ ان میں سے کچھ کی تعمیر سلطان صلاح الدین ایوبی نے کرائی تھی اور دیگر کی بعد کے مملوک سلاطین نے۔ احاطے سے ملحق ایک وسیع قبرستان ہے اس میں ان شہداء کے مقابر ہیں جو سلطان صلاح الدین ایوبی کی فوج میں شامل تھے۔ اس گورستان جرات کے پیچھے سے ایک سڑک جیر کو کی جانب دوڑے چلی جاتی۔ ہم نے بھائی امین کا اس سعادت عظیم پر شکریہ ادا کر کے رخصت چاہی تو وہ کسی طور رضامند نہ ہوئے۔ ہمارے عبدالقادر صاحب ان کے بچپن کے دوست تھے اور ملاقات بھی ایک طویل



عرصے کے بعد ہوئی تھی لہذا طعام لازم تھا۔ ان کے اس چھوٹے سے صحرائی گھر کے برآمدے میں بیٹھ کر مجھے لگا کہ اس کاسکون اس کی وسعت سے میرا مزاج بہت ملتا ہے۔

یہ میرے لوگ ہیں، میرے قبیلے کے میرے اپنے ساتھی۔ کھانا سادہ سا تھا پھلی کا سالن اُبلے ہوئے چاول، گاجریں اور گو بھی۔ یہ مجھے کئی مرتبہ بہت ٹونی قسم کے فیرینج ریسٹورانوں میں کھائی ہوئی ڈشوں سے زیادہ من بھاتا اور لذیذ لگا۔ رخصت ہوئے تو عبدالقادر کارآہستہ سے چلا رہے تھے اور میں اپنی کچھ دیر پہلے کی کیفیات میں غلطاں و پچپاں یہ سوچ رہا تھا کہ اس سفر میں اللہ کریم نے مجھ پر میری توقعات سے بڑھ کر عنایات کی ہیں۔ میں ان مناظر اور مقامات کو خواب میں بھی نہیں سوچتا تھا۔ حضرت موسیٰ کے مزار کا منارہ بہت دھیرے دھیرے صحرا کے اُفق پر معدوم ہوتا جا رہا تھا۔ میں بوجھل دل سے ان چھوٹے گنبدوں اور درودیوار کو دیکھے جا رہا تھا۔ بس یہ خیال دل کو چھ رہا تھا کہ جانے اب یہ سب پھر سے دیکھنا نصیب ہو کہ نہ ہو۔ ایک تعلق، ایک یاد، ایک پیار ہے جو ریت کے ان ٹیلوں سے پرے کہیں غائب ہوتا جا رہا ہے۔ میں سوچنے لگا کہ جانے عبدالقادر اب اور کیا چمتکار دکھائے گا۔ اچانک اس نے میرے خیالات کا شیرازہ اپنی گرج دار آواز سے بکھیر دیا۔ اب کہاں چلیں؟



شہر جیریکو

”جیریکو اگر وہ قریب ہے؟۔ میں نے سوال نما تجویز پیش کر دی!  
”ہاں یہ ٹھیک ہے کیوں کہ وہ بہت قابل دید جگہ ہے۔“

اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے بڑی لبھاؤ بھری تائید کی۔

یروشلم سے باہر نکلتے ہی آپ بہت تیزی سے سطح سمندر سے نیچے اترنا شروع کر دیتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کا مزار بھی سطح سمندر سے تین سو فٹ نیچے ہے۔ یہ حال شہر جیریکو کا ہے جو 850 فٹ نیچے ہے۔ یہ بلندی یہ پستی جغرافیہ کو بھی بہت تیزی سے بدل دیتی ہے۔ ریت کے ٹیلے اب اونچے ہوتے جا رہے ہیں۔ ارے یہ کیا، وہی اونٹ بدستور اسی بددلی اور بے نیازی سے اسی پیڑ کے نیچے بیٹھا تھا جو ہمیں مزار کی جانب جاتے ہوئے دکھائی دیا تھا۔ نوکلومیٹر کے فاصلے کے بعد ہم شہر جیریکو میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جیریکو دریائے اردن کے مغربی کنارے پر ہے۔ اس کا شمار ”اے“ کیٹیگری کے علاقوں میں ہوتا ہے جس کا مطلب یہ کہ یہودی یہاں نہیں داخل ہو سکتے۔ شہر کے آغاز میں ہی ایک وارنگ بورڈ بھی ہے۔ شہر میں داخل ہوتے ہی ہم اس قدیم شہر کی ہماہمی میں پڑ جاتے ہیں۔ جیریکو کا عربی نام اریحا بمعنی ”معطر“ کے ہے۔ شہر میں داخل ہوتے ہی آپ کو اس فضائے معطر کا احساس ہو جاتا ہے۔

یہ شہر میں نے عرض کیا تھا کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے نو ہزار سال پہلے سے آباد ہے۔ اس میں اور شہر دمشق میں ضد لگی ہوئی ہے کہ دونوں میں قدیم ترین شہر کونسا ہے جو مسلسل آباد چلا آ رہا ہے۔ قدیم شہر اتنے چھوٹے نہیں ہوتے لہذا میرا ووٹ دمشق کے حق میں جاتا ہے۔

\*\*\*\*\*

دنیا بھر کے قدیم شہروں دمشق، روم، قاہرہ، استنبول، بغداد، لندن، کوئیٹو، دہلی، شنگھائی اور نان جنگ تو، میں ایک بات بڑی مشترک ہے کہ ان کی آبادی اتنی کم جتنی شہر جیریکو کی ہے یعنی کل پچیس ہزار کے لگ بھگ۔ جب کہ اس کا ذکر نئی پرانی دونوں بائبلوں میں ملتا ہے۔ وہ اسے پام کے درختوں کا شہر کہتی ہیں۔ کسی بھی عرب شہر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلا سامنا اس کے بے ہنگم ٹریفک سے پڑتا ہے۔



شہر جیریکو

اسرائیل کا دیگر شعبہ ہائے زندگی میں مثالی نظم و ضبط اس بد نظمی پر غالب نہیں آسکا۔ قادر کی گاڑی کے سامنے ایک اسکوٹر جس پر تین نوجوان افراد کا ایک بے نیاز ٹولہ سوار ہے بڑے اطمینان سے رکاوٹ بن کر موجود ہے۔ قادر نے کار کا شیشہ اتار کر انہیں عربی میں یاد دلایا کہ ان کے ماں باپ ان کی پیدائش سے پہلے شادی کرنا بھول گئے تو وہ جلد گھر جا کر انہیں یاد دلانیں۔ اسے اس گالم گلوچ پر کچھ خفت ہوئی تو پوچھنے لگا کہ کیا جنوبی افریقہ میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ ارے نہیں! یہ بد نظمی مسلمان ہونے کی ایک بڑی علامت ہے میرے اپنے دیس پاکستان میں بھی یہ نظارہ بہت عام ہے۔ اس حوالے سے ان بچوں کے والدین کے بھائی بہن ہمارے ملک میں بہت ہیں۔ وہ میری بات سن کر زور سے ہنس پڑا۔ ایک عرصہ تک جیریکو کا شمار سب زیادہ کھودی جانے والی بستی میں ہوتا تھا۔ یہ اعزاز مجھے اندیشہ ہے کہ لاہور شاید جلد ہی اس سے چھین لے۔



آثارِ قدیمہ کے ماہرین ہمہ وقت یہاں کچھ نہ کچھ ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں۔ شہر کا قدیم حصہ جہاں یہ کھدائی جاری ہے اسے ”ظلّ سلطان“ کہتے ہیں۔ اس حصے کے بارے میں اندازہ ہے کہ یہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے نو ہزار سال قبل کا ہے۔ شہر کے بارے میں اس کے قدیم ترین ہونے کا اعلان داخلے کے وقت ایک بورڈ کرتا ہے۔ بنی اسرائیل جب یہاں مصر سے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ آئے تو ان کی مقامی آبادی کے ساتھ پہلی جنگ اسی مقام پر ہوئی تھی۔ ان کی فوج کی قیادت ایک یہودی صوفی جوشوا (Joshua) کر رہے تھے۔ انہوں نے شہر کا سات دن تک محاصرہ کیے رکھا۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ ساتویں دن جب انہوں نے مینڈھے کا سٹکھ بجایا تو اس کی پھونک سے قلعے کی دیوار ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑی۔ شہر کی پوری آبادی کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ کیا مرد و زن، کیا بچے، بس ایک طوائف رباب کو زندہ چھوڑ دیا گیا۔ جنگ کے آغاز سے پہلے یہودی جاسوس اس کے ہاں پناہ لیتے تھے۔

ہم جلد ہی شہر کے مرکز میں آن پہنچے۔ یہ قدرے اجڑا ہوا سا ہے۔ اس سے ایک یاسیت سی جڑ گئی ہے۔ جیریکو کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ تاریخ کے بے رحم تھیٹروں نے اسے ہر اسماں اور بے دم کر دیا ہے۔ اس کے حسن اور رونق انگیزی میں اگر کسی نے کبھی اضافے کی کوئی کوشش کی ہے تو وہ خلافت عباسیہ کے حکمران تھے۔ ان ہی کے دور میں یہاں آب رسانی کا بندوبست کیا گیا۔ زراعت کو بھی خاص فروغ ملا۔ وہ رخصت ہوئے تو یہ شہر پھر سے بے توجہی کا شکار ہو گیا۔ اب بھی اس شہر کا یہی عالم ہے کہ اس کی دیواروں پر لگتا ہے ادا سی بال کھولے سورہی ہے۔ اس کے قہوہ خانے بے رونق ہیں اور شاہراہوں پر بے رونقی رواں دواں رہتی ہے۔ یہ شہر بے حد قدمت پسند ہے مجال ہے جو کوئی خاتون آپ کو یہاں بے وجہ گھومتی دکھائی دے۔ ہر تیسری دکان کار میکنگ کی ورکشاپ ہے۔ اس لیے کہ یہاں سبھی گاڑیاں بہت پرانی ہیں۔ ہم ایک شاپنگ سینٹر میں جادھمکے۔ اس کے ورائڈے میں دکاندار اپنی مجلس جمائے بیٹھے تھے۔ دور دور تک گاہک کا کوئی پتہ نہ تھا۔ عبدالقادر کو دیکھتے ہی یہ سب اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ اس نے ایک نشست پکڑی اور وہاں موجود کسی نوجوان کو اشارہ کیا تو وہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے آگ سے حفاظتی زینے سے چھت پر لے گیا۔ یہاں سے ظلّ سلطان کے کھنڈرات باسانی دیکھے جاسکتے ہیں۔

چھت سے دائیں طرف دیکھیں تو آپ کو نو تعمیر شدہ فلیٹوں کا ایک جنگل دکھائی دیتا ہے جیسے کراچی کا گلستان جوہر۔ چھوٹی ماچس کی ڈبیا کے جیسے بلڈنگ بلاک جنہیں نیم پختہ مٹی کی سڑکوں نے ایک دوسرے سے جدا کیا ہوا ہے۔ یہیں ایک بہت بڑا ٹیلا بھی تھا جس کے دامن میں ایک مٹیا لامدھم کلیسا بھی دکھائی دیتا ہے۔ ایک چیئر لفٹ کہیں سے فضا میں تیرتی ہوئی کلیسا کی جانب دکھائی دی۔ میرے نوجوان رفیق نے بتایا کہ یہ دیو القرنطل ہے یعنی Mount of Temptation۔

یہ حضرت عیسیٰؑ کے چھ سو سال بعد عین اس مقام پر بنائی گئی تھی۔ جو امتداد زمانہ کے ہاتھوں برباد ہو گئی۔ اس مقام پر چالیس دن اور رات حضرت عیسیٰؑ کو شیطان ان کے مراقبے میں ورغلاتا رہا۔ آپ غور فرمائیں پہاڑوں کی تینوں بڑے مذاہب اور ہندو مذہب میں بھی بڑی

اہمیت ہے۔ حضرت موسیٰ نے کوہ سینا پر چالیس دن، حضرت عیسیٰ نے کوہ القرنفل پر اور ہمارے نبی ﷺ نے غار حرا میں اپنے روحانی سفر کے لیے اہم پڑاؤ ڈالا تھا۔ جب صلیبی جنگوں میں عیسائی غالب آئے تو یہاں انہوں نے دو عبادت گاہیں بنائیں اور اس پہاڑ کا نام قرانط رکھا جو اطالوی زبان میں چالیس کے ہندسے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیریکو مسلمانوں کے پاس حضرت عمر ابن خطابؓ کے دور سے چلا آ رہا ہے۔ اس علاقے کی زمین بھی مسلمانوں کے قبضے میں تھی۔ ان سے قدیم یونانی چرچ نے یہ زمین خرید کر جسے 1895 میں موجودہ کلیسا کو تعمیر کیا۔ یہاں وہ غار بھی اور وہ پتھر لی نشست بھی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اس میں قیام پزیر رہے اور اس پر چلہ کیا کرتے تھے۔ یہاں آپ نے چالیس دن روزے بھی رکھے۔ عیسائیوں کے ایسٹر کا تہوار اس چالیس روزہ عرصہ صوم کے اختتام پر منایا جاتا ہے۔ چھت سے نیچے آن کر ہم نے قادر کے دوستوں سے رخصت لی اور اپنا سفر جیریکو کے مشرق میں جاری رکھا۔

شہر سے ذرا باہر نکلیں تو ہشام بن عبد الممالک کا محل قصر ہشام آ جاتا ہے۔ اب اسے خرابات ال مفجر بھی کہتے ہیں۔ آپ کو یاد ہو تو ان کے والد عبد الممالک بن مروان مکہ کے گورنر تھے۔ قبۃ الصخری کی تعمیر عبد الممالک نے شروع کی تھی اور اس کی تکمیل ہشام بن عبد الممالک یعنی اس کے صاحبزادے کے دور میں ہوئی۔

یہاں پہنچ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے چینی سیاحوں سے بھری بس دیکھی۔ ایک سیاح کو انگریزی بولتے دیکھ کر میں نے نیم دلانہ طنزیہ انداز میں پوچھ لیا تو اس نے کندھے لا علمی سے ہلا کر اپنی بیوی کے ساتھ ایک رومانٹک پوز بنایا اور ستون کے سامنے کھڑے ہو کر دونوں نے ایک تصویر کھینچنے کی فرمائش کی۔ میں نے سوچا! پاکستان میں سی پیک منصوبے پر بُرے اثرات نہ پڑیں، اس وجہ سے مسکرا کر تصویر کھینچ لی ورنہ میری طبیعت ان چینیوں کو مقدس مقامات پر دیکھ کر جو اُبتی ہے وہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔

محل کے کھنڈرات سے ذرا دور اقوام متحدہ کا وہ پناہ گزین کیمپ ہے جہاں فلسطینیوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے۔ ویسے گھر چھوڑنا ہر حال میں بہت گراں فیصلہ ہوتا ہے مگر اپنے ملک میں ہی تصویر بے کسی بن کر پناہ گزین کا درجہ پانا یہ روح کو کچل کر رکھ دینے والا عمل ہے۔ یہاں یہ گھرانے یروشلم سے بے دخل کیے جانے کے بعد ہو سٹل کے کمروں میں آباد ہیں۔ جیل کی ان بیرکوں کو چار اطراف سے ایک بلند و بالا دیوار نے احاطہ کر رکھا ہے۔ ان کی ناگفتہ بہ غربت اور دکھ بھری زندگی، انسانیت کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔ یہ سوچ کر اور بھی دکھ ہوتا ہے کہ قازقستان، چاڈ، نائجر اور سوڈان وہ علاقے ہیں جہاں زمین کی بہتات اور قطر، برونائی، کویت، بحرین، سعودی عرب وہ ممالک ہیں جہاں دولت کی بہتات ہے۔

میرے لیے چار ممالک کے مسلمانوں کی بہتر زندگی اب ہر دعا کا حصہ ہے۔ میری درخواست آپ سے بھی یہی ہے۔ دعا نصیب بدل دیتی ہے، مظلوم کے لیے دعا بھی جہاد ہے۔ ان بے چارے بے وطنوں سے زیادہ مجبور اور بے کس کوئی اور طبقہ مسلمانان نہیں۔ برما کے روہنگیا، چین کے یو غورز، شام، عراق اور فلسطین کے عرب اور کشمیری۔

ہم دونوں نے بہت کوشش کی کہ ہم اندر جا کر ان سے مل پائیں۔ اقوام متحدہ کا گارڈ کسی طور نہ مانا۔ ہمیں گیٹ پر دیکھ کر چند بچے ایک بالکونی میں جمع ہو گئے۔ عبدالقادر نے بتایا کہ بعض مرتبہ سیاحوں کو خصوصی انتظام کے تحت اندر جانے کی اجازت مل جاتی ہے۔ وہ انہیں مٹھائیاں، کھلونے، کپڑے دیتے ہیں۔ یہ بچے ہمیں دیکھ کر اس بالکونی میں اس لیے جمع ہو رہے ہیں کہ تحائف کی یہ تقسیم یقینی اور آسانی ہو جائے۔ میں نے سوشیکل کا ایک نوٹ نکال کر گارڈ کو دیا کہ وہ ان مشتاقان تحائف کو دے دے، اس نے وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ میں بوجھل دل سے کار میں سوار ہوا تو ان بچوں کی مایوسی دیدنی تھی۔

مڑتی ہوئی شاہراؤں اور بڑھتے ہوئے فاصلے ان کے معصوم وجود میری نگاہوں سے چھینے چلے گئے۔

”فلسطین کے خبیث، نونہالوں  
میری زندگی تمہارے شورِ مسلسل سے نالاں ہے  
ہر صبح تمہاری کلکاریاں میرے سکون کو غارت کر دیتی ہیں  
تم نے ہی میری بالکونی میں رکھا گلہ دان توڑ ڈالا ہے  
میرے باغ کے گلاب بھی تم ہی چرا کر لے جاتے ہو  
آؤ، چیخو! اس قدر چیخو کہ تم خوش ہو جاؤ  
یہ شور ہی میرے لیے زندگی کی علامت ہے  
سارے گل دان توڑ ڈالو  
سارے پھول چرا لو  
بس آ جاؤ کہ فلسطین تمہارا ہے  
(خالد جمعہ کی نظم کا غیر پابند ترجمہ)



Oh Rascal Children Of Gaza

,Oh rascal children of Gaza

,You who constantly disturbed me with your screams under my window

,You who filled every morning with rush and chaos

,You who broke my vase and stole the lonely flower on my balcony

—Come back

,And scream as you want

,And break all the vases

,Steal all the flowers

,Come back

Just come back...

Khaled Juma

Come back scream as loud as u wish.

Break all the vases

Steal all the flowers

Come back

Just come back” ( a Palestinian poem)

\*\*\*\*\*

اسرائیل میں یوں تو دوران سیاحت مجھے متعدد دلچسپ ہستیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا مگر اس فہرست کا سب سے درخشاں نام بغیر کسی دقت کے عبدالقادر کے روپ میں مل جائے گا۔ فلسطین کی اگر اپنی کرکٹ ٹیم ہوتی تو میرے سفری رہنما عبدالقادر کے سارے بچے اس میں شامل ہوتے اور وہ خود اس کے چیئر مین پی سی بی ہوتے، یعنی فلسطین کرکٹ بورڈ۔ موصوف گیارہ بچوں کے والد محترم اور 23 بچوں کے نانا یاد ادا تھے۔ اس قدر کثیر العیال ہونے کے باوجود حضرت کے طور اطوار ایک کھلنڈرے، نپٹ، لونڈے لپاڑوں جیسے تھے۔ حس مزاح برجستہ، چبھتی ہوئی، کٹھور اور کاٹ دار۔ دو برس پہلے کہیں دل تھام کر بیٹھ گئے تھے تو بائی پاس ہوا تھا۔ وہ آپریشن محض انہیں وقتی خرابی کا معالجہ لگا۔ اس کے بعد کیسی احتیاط، کہاں کی چننا، پرانے ریلوے انجن کی مانند سگریٹیں پھونک پھونک کر دھواں چھوڑتے تھے اور ہر کھانا غم نہ دار دکان پر مستانہ لگا کر آخری کھانا سمجھ کر کھاتے تھے۔ تمام فلسطینی عربوں کی مانند صلوٰۃ کی ادائیگی وقت پر کرتے تھے۔ لیکن کیا مجال ہے کہ دوران صلوٰۃ بھی قرب وجوار سے کوئی دلنشین حسینہ گزر جائے تو اپنے سلام میں اسے بھی شامل نہ کریں۔ اس حوالے سے شیشہ دل ہر وقت اُچھالتے رہتے تھے اس دویدا (ہندی میں الجھن) کے بغیر ہی کہ، یہ کہیں روٹھ جائے گا، یہ کبھی ٹوٹ جائے گا۔ خواتین سے دل لگی اور چھیڑ چھاڑ کے معاملے میں حضرت کا انداز بالکل اطالوی مردوں جیسا پر اعتماد، جرات مندانہ اور خوف خمیازہ سے بے نیاز ہوتا تھا۔ ہمارے ہاں کے گیلی لکڑی کے دھوئیں یا برہا کی سیلی سیلی، سسکیاں بھرتی راتوں جیسے مردوں والا نہیں کہ بقول مصطفیٰ زیدی مرحوم ع

ہزار مصلحتوں کا شمار کرتے ہیں

تب کہیں زخم جگر اختیار کرتے ہیں

حضرت موسیٰ کے مرقد عالیہ کی زیارت اور حیریکو کے سفر میں ہماری رفاقت نے زمان و مکان کی قیود کو کچھ اس سرعت سے پھلانگا کہ ہم اس عرصہ قیام میں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو گئے۔ میرے پاس وہ تبدیلی قلب کی جراحی کے لیے آتے تو میں انہیں دنیا میں مشہور ترین جنوبی افریقا کی De Beers کمپنی کے ہیروں سے مرصع 24 قیراط سونے کا دل لگا دیتا۔ عبدالقادر کا دل نکال کر بطور ماڈل اپنے پاس رکھ لیتا اور اپنے سرجری کے طالب علموں کو بتاتا کہ مجروح اور شکستہ ہی سہی ایک اچھا انسانی دل دیکھو بالکل ایسا ہوتا ہے۔

میں جتنے دن اسرائیل میں رہا ہم دن کے آغاز سے رات کے پچھلے پہر ساتھ ہی رہے۔ ہم نے کھایا ساتھ، ہنسے بھی ساتھ ہی۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ میں اپنے سگار کے قیمتی ذخیرے سے اسے پینے کے لیے سگار کی پیشکش کرتا تو وہ اسے گناہ بے لذت کہہ کر ٹھکرا دیتا۔ اس کے پھپھڑوں کو دھونکنے کے لیے اسرائیل کے سستے Noblesse سگریٹوں میں چوری کے بوسوں کی لذت محسوس ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ کھانا کھانا بہت بڑا مرحلہ ہوتا تھا۔ بل کی ادائیگی پر وہ کسی لحاظ کے بغیر دست و گریباں ہو جاتا۔ مجھے اسے یقین دلانا پڑتا کہ میں بھی

پرانا ہاشمی ہوں، قبائلی ہوں میری بھی کچھ نسلی روایات ہیں۔ کھانا کھانا میرے لیے بھی باعث توقیر ہے۔ وہ مجھے اپنا برادر گمشدہ ضرور سمجھے اور مجھ سے برادران یوسف والا سلوک نہ کرے۔

وہ مجھے اریحا (جیریکو) سے رات گئے واپسی پر بحیرہ مردار لے جانے کے لیے ہوٹل کے استقبالیہ پر اگلی صبح چھ بجے ہی موجود تھا۔ سفر کے جلد آغاز کا سبب یہ تھا کہ راستے میں ہمیں کئی چیک پوسٹوں پر رکتا تھا۔ کار میں بیٹھتے ہی عبدالقادر نے سفر کی دعائے نوح پڑھی اور ہم بحیرہ مردار کے طویل سفر پر چل پڑے۔ سیاحوں، سائنسدانوں اور اہلیان عقیدت کے لیے یہ مقام ہمیشہ سے بے حد دل چسپی کا حامل رہا ہے۔ میرے اندر یہ تینوں دل چسپیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ سیاحت مشغلہ ہے، سائنس اور تعلیم پیشہ اور عقیدت میرے تفکر کا نتیجہ ہے۔



بحیرہ مردار کو جانے Dead Sea کیوں کہتے ہیں۔ سمندر تو وہ ہے بھی نہیں۔ وہ تو ایک بڑی سی جھیل ہے۔ دنیا کا قدیم ترین آبی ذخیرہ جو سطح سمندر سے سب سے نچلی سطح پر ہے۔ اس کے اطراف میں نمک کی پہاڑیاں ہیں۔ ادھر ادھر سے بھولے بھٹکے چشمے اور ان ہی پہاڑیوں کی دراڑوں سے بہتا ہوا بارش کا پانی اس جھیل میں رستار ہتا ہے جسے باہر بہہ نکلنے کا کوئی راستہ میسر نہیں۔ بحیرہ طبری یعنی Sea of Galilee بھی دریائے اردن کے طفیل چوری چھپے اسے اپنا کچھ پانی دے دیتا ہے۔ شدید گرم موسم اور خشک ہوائیں اسے بخارات بنا کر اڑاتی رہتی ہیں جس کی وجہ سے برومائڈ اور کلورین جیسے مادوں کی ایک کچڑ بن جاتی ہے جس کی وجہ سے اس میں اتنی نفوذیت یعنی osmolality ہوتی ہے کہ اس وجہ سے اس میں اجسام ڈوب نہیں پاتے۔ یہی وجہ کہ اس پانی کی کثافت سیاست دانوں کے



ضمیر کی طرح ہلکی ہے۔ آپ اس کی سطح پر لیٹ کر آرام سے کوئی بھی پاکستانی اخبار پڑھ سکتے ہیں جس طرح اس کی خبریں آپ میں نہیں ڈوب پاتیں ویسے ہی آپ بھی سطح آب پر ہاتھ پیر مارے بغیر تیرتے رہتے ہیں۔ اس کی یہ نمکیاتی ہیئت اسے کسی بھی قسم کے جاندار کے لیے ناقابل نمو بنا دیتی ہے۔ اسی وجہ سے عرب اسے بحیرہ مردار کہتے ہیں۔ قریب کی نمکین پہاڑیاں موسم کے ساتھ ریمپ پر اٹھلاتی ماڈلز کی مانند اپنے خدو خال بھی بدلتی رہتی ہیں۔ عقیدت مندوں کو ایمان کو تقویت بخشنے کے لیے ایک ایسی ہی بڑی چٹان نے سارہ کا روپ دھار لیا ہے۔



بائبل نے حضرت لوط علیہ السلام کی نافرمان بیوی کو سارہ کے نام سے پکارا ہے۔ قرآن الکریم میں حضرت مریم کے علاوہ کوئی خاتون نام سے مذکور نہیں، نہ حضرت آدم اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کی ازواج نہ اُمہات المؤمنین نہ ہی ہمارے نبی پاک ﷺ کی بنات العالی مرتبت۔ حتیٰ کہ ابو لہب کی بیوی اروی بنت جمیل جو ابوسفیان کی بہن تھی اسے بھی امرائے یعنی اس کی عورت کے ضمیر اشارہ سے پکارا۔

قرآن کا یہ اعجاز عظیم ہے کہ وہ بہت ہی Impersonal ہے۔ اس کے برعکس سورۃ التحریم کی آیت نمبر 66 میں حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں کو ان کی نافرمانی کے باعث دوزخ کا ایندھن بنا دیا گیا ہے۔ اسی طرح سورۃ الشعرا کی آیت نمبر 171 میں کہا گیا ہے کہ

”ہم نے آخر کار اس کے سب اہل و عیال کو بچا لیا بجز ایک بڑھیا کے جو مطعون افراد میں شامل تھی“ مجھے لگتا ہے کہ سائنس کے فروغ سے پہلے انسانی ذہن بہت سادہ تھا۔ تخیلاتی باتوں کو زیادہ آسانی سے تسلیم کر لیتا تھا۔ ایسا ہی کچھ اس چٹان والے بت کے ساتھ صحرائے یہود میں ہوا جہاں خوف اور توہمات کے غلبے میں اس بے رحم گرد و پیش میں بائبل کا یہ بیانیہ بھی جڑ پکڑ گیا۔

تیسری صدی میں یہاں آئے ایک عیسائی راہب ٹرائی رس نے ایک سیاہ نابینا اژدہ کو دیکھنے کا قصہ بیان کیا جو بحیرہ مردار کی پاتال میں ڈیرہ جما کر بیٹھا تھا۔ علم حیوانیات آپ کو بتائے گا کہ بڑے سانپ زہریلے نہیں ہوتے مگر ان کے مسلز اور معدہ دونوں ہی بہت طاقتور ہوتے ہیں

صدوم اور گمراہ کی ان بستیوں کے جانب عقیدت کی جھولیاں پھیلانے ایک مخصوص طرز فکر کے سیاح اور راہ نور د شوق جوق در جوق آتے رہے۔ انہیں عقیدت کے شیرے میں لتھڑے جیالوں میں ایک صاحب جوزفس (Josephus) بھی تھے۔ وہ یہاں پہلی صدی میں آئے تھے۔ انہیں یہ نمکیاتی ٹیلے اور صدوم اور گمراہ کی عبرت انگیز داستانیں بہت عجیب لگیں۔ سب سے پہلے ان ہی کو اس چٹان میں حضرت لوط علیہ السلام کی نافرمان بیوی کی جھلک دکھائی دی تھی۔ ان ہی نے یہ قصہ مشہور کر دیا کہ یہ سارہ ہے، حضرت لوط کی مطعون بیوی۔ وہ بحیرہ مردار سے اس قدر دہشت زدہ ہوا کہ اسے ”آگ کی بھٹی“ سے تشبیہ دے بیٹھا۔ اس کا پانی اسے سیاہ جھاگ اڑاتا لاوا دکھائی دیا جس پر ہمہ وقت دھوئیں کے بخارات بھرے بادل بلند ہو رہے تھے، جن کے چھینٹے ایک قہر بھری لعنت بن کر سارا کے اس بت کے چاروں طرف پڑ رہے تھے۔

اس کے بعد کے اسی قبیل کے سیاحوں نے اس بیانیے کو تو اتر سے فروغ دیا۔ تیسری صدی میں یہاں آئے ایک عیسائی راہب ٹرائی رس نے ایک سیاہ نابینا اژدہ کو دیکھنے کا قصہ بیان کیا جو بحیرہ مردار کی پاتال میں ڈیرہ جما کر بیٹھا تھا۔ علم حیوانیات آپ کو بتائے گا کہ بڑے سانپ زہریلے نہیں ہوتے مگر ان کے مسلز اور معدہ دونوں ہی بہت طاقتور ہوتے ہیں۔ وہ مگر مچھ جیسے سخت جان کی ہڈیاں گرفت میں آنے کے بعد ایک دفعہ میں کرچی کرچی کر دیتے ہیں۔ راہب ٹرائی رس کے بقول اس اژدہ کا زہر ساری دنیا میں سب سے زیادہ موذی تھا۔ کمال یہ تھا کہ کوئی اگر اس کا ذرا سا نمونہ حاصل کر کے دنیا بھر کے سانپوں کے زہر کا توڑ بنالیا تھا یہ توڑ انگریزی میں Tiriack کہلاتا اب آپ کو عربی، اردو اور فارسی زبان میں مستعمل لفظ تریاق باسانی سمجھ آ گیا ہو گا۔

مگر اب ایک مسئلہ اور تھا عیسائی راہب کو وہ اژدہ تو دکھائی دے گیا اور اس کے زہر سے کشید شدہ توڑ بھی مل گیا مگر سارہ کا وہ نمکیلا مجسمہ کہیں دکھائی نہ دیا۔ اسے گمان ہوا کہ یا تو نمک کا یہ مجسمہ بخارات میں گھل کر ریزہ ریزہ ہو گیا ہے۔ اس نے پہلے سے موجود قصائص کی تصدیق اور خود معتبر لگنے کے لیے اب اس میں ایک نیا تخیلاتی تڑکا لگایا کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اس کی سزا میں اتنی تخفیف کر دی ہے کہ

اس میں اس کی روح کو لوٹا دیا ہے۔ وہ سارے علاقے میں گھومتی پھرتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی وہ بے قرار ہو کر بحیرہ مردار کی تہہ میں بھی چلی جاتی ہے تاکہ وہ اس تہہ میں دبی ہوئی صدوم کی برباد بستی میں اپنے گناہ گار رفیقوں کی دل جوئی کر سکے۔ دین میں کچھ لوگ ایسی ایسی تاویلیں نکال لاتے ہیں کہ معصوم لوگوں کے غول کے غول انہیں مہدی، امام اور پیر سمجھ کر پیچھے چل پڑتے ہیں۔ یہ ہم بد نصیب کم پڑھے ممالک تک ہی محدود نہیں۔ ذرا سوچیے امریکا کا ایک بہت ہی ٹونی قصبہ رانچو سانتا فے جو کیلیفورنیا میں ہے ایک سابق امریکی فوجی جسے کارپوری میں چھ ماہ جیل بھی ہو چکی تھی یعنی Marshall Applewhite جسے بو اور ڈو کے القاب سے پکارا جاتا تھا اپنے چالیس کے لگ بھگ مالدار معتقدین کو سن 1997 میں یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ اس کی مرحوم بیوی ایک خلائی جہاز لے کر آرہی ہے جو دنیا کے سامنے دمدار ستارے Bopp-Comet Hale کی صورت میں نمودار ہوگا۔ وہ دراصل جنت کے لیے ایک ایڈوائس پارٹی لینے آرہی ہے۔ سب مریدین و مشتاقان فردوس پر جو اس جہاز میں سوار ہو کر جنت میں اپنی جگہ سب سے پہلے بنانا چاہتے ہیں وہ چپ چاپ نائیکی کے نئے جوگرز، مرد سیاہ اور خواتین کھلتا ہوا جامنی ٹریک سوٹ پہن کر زہر ملا کو کو کولامیں پی کر پلاسٹک کی صاف تھیلیاں منہ پر چڑھا کر بیٹھ جائیں تاکہ وہ عالم خواب میں اس خلائی جہاز میں سوار کر دیے جائیں۔ یقین جانے ان سب نے اجتماعی خودکشی ایسے ہی کی اور یہ کوٹادو کی بلندی والا یا شاہ آباد رامپور کی چھوٹی سی بستی نہ تھی یہ امریکا کی بہترین ریاست کا بہترین پڑھا لکھا خوشحال علاقہ تھا۔ عیسائی راہب تو جانے کیا ڈھونڈتا رہا مگر تجسس یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ صدوم اور گمراہ کی وہ برباد اور لعنت زدہ بستیاں جنہیں ہم جنس پرستی کی وجہ سے ایسے تاراج کیا گیا کہ وہ آج تک آباد ہی نہ ہو پائیں۔

کیا وہ واقعی اس سمندر کی تہہ میں چھپی ہیں یا وہ جنوب میں صحرائے یہودا کے ریت کے ٹیلوں میں مدفون ہیں۔ اس بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں پائی جاتی۔ یہ ماہرین آثار قدیمہ کے لیے ایک پہلی ہے۔ بحیرہ مردار جنوبی سمت میں بہت کم زیر آب ہوتا ہے یہاں سے ایک طویل دلدلی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں آج بھی کوئی آبادی نہیں اور نہ ہی کبھی یہاں سے کسی بستی کی کوئی علامت ملی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب ماہرین ریت کے ٹیلوں میں یہ علامات ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ ابتدائی علامات سے یہ ظاہر ہونے لگا ہے کہ ریت نے احساس شرمندگی سے ان دو بستیوں کو اپنے اندر دبوچ لیا ہے۔ ابھی ہم بحیرہ مردار سے کچھ دور ہی تھے۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ کافی دیر سے راستے میں چٹانوں کے جو ٹکڑے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بتدریج اب نمک کے ٹیلوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ لگتا ہے، ہم بحیرہ مردار کے نزدیک پہنچ گئے ہیں۔ میں نے عبدالقادر سے پوچھا جو آواز بلند کسی سے سیل فون پر بحث میں مصروف تھا۔ میرے سوال کا جواب اس نے تیزی سے بائیں جانب ایک روڈ پر موڑ کاٹ کر دیا اور بحیرہ مردار کی پانی کی چادر تیز دھوپ میں چمکنے لگی۔ اس پر بخارات اور نہ ہی جھاگ کی کوئی علامات تھیں۔ دوسری جانب اردن تھا اور ایک مناسب مقام جہان Neve Midbar beach کا بورڈ نصب تھا وہاں پر عبدالقادر نے کار پارک کر لی۔ یہ مقام سیاحوں میں خاصا مقبول ہے اس کی پہلی سب سے مصدقہ علامت تو ہر طرف کھلبلاتے چینی سیاح ہیں۔ کچھ عرب خاندان بھی بھیڑ کے گوشت کا باربی کیو کر رہے تھے۔ چادلوں کے ابالے جانے کی اور گوشت کے بھونے جانے کی خوشبو سے میری بھوک مچل گئی۔ ویسے تو وہاں پانی میں تیرنے کی سرکاری فیس اسرائیل کے 85 شیکل یعنی ہمارے ڈھائی ہزار



روپے ہے مگر عبدالقادر نے ٹکٹ گھر میں بیٹھی اس حسن سوگوار تقریباً پینتیس سالہ یہودن کو اللہ جانے عبرانی زبان میں کیا کچھ کہا کہ وہ پہلے حیرت زدہ ہوئی پھر کھلکھلا کر ہنسی، ایک گہری توصیفانہ نگاہ مجھ پر ڈالی اور ہمیں مفت میں نہانے کی اجازت دے دی۔ مجھے لگا کہ اس نے میری جانب معنی خیز انداز میں دیکھتے ہوئے اسے خاتون سے کہا کہ دیکھو دل کا کوئی بھروسہ نہیں کبھی بھی دھوکا دے سکتا ہے، چلتے چلتے جھٹکے مار سکتا ہے۔ یہ تمہاری مفت سرجری کر دے گا۔ اگر میاں کو ٹھکانے لگا کر مجھ سے بیاہ کرنا چاہتی ہو اور یہودیوں اور مسلمانوں کے اختلاف ختم کرنا چاہتی ہو تو یہ میرا ایسا دوست ہے کہ وہ اسے دوران آپریشن ٹھکانے لگا دے گا تمہارے ہاں تو عدت بھی نہیں۔ ہم جلد ایک ہو جائیں گے۔

میں نے جب تصدیق چاہی تو وہ مجھے کہنے لگا کہ میں نے اسے کہا کہ سرجن کاشف ماہر امراض قلب ہے ساری دنیا میں مشہور۔ وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ تمہارے بحیرہ مردار کے پانی کا دل پر کیا اثر ہوتا ہے۔ اچھے شیف کی طرح کھانا پہلے خود چکھنا پڑتا ہے۔ تو تم نے اس معصوم یہودی عورت سے جھوٹ بولا۔ جس کے جواب میں اس نے میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ان پر ہمارا بہت قرضہ ہے۔ میں نے اسے بتلایا کہ مرد ہونے کے ناطے مجھے اندازہ ہے کہ تم نے اس کے حسن سوگوار کی بھی بہت تعریف کی تھی۔ اب وہ ایک خاص عربی انداز میں جیسے پرانی مورس کار کہیں برف پر گھسٹ رہی ہو، کھسانی ہنسی ہنسا۔ میں نے کہا۔ ”اس ٹوٹے ہوئے سر میں تمہاری دل چسپی دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ تمہارے ارادوں میں بڑی بربریت ہے۔ مجھے تمہارے معیار حسن کے ذوق پر حیرت ہے۔“

میری اس طنز کا جواب اس نے اپنے تجربات کی پٹاری سے ایسا نکالا کہ میرے لیے وہ اک زادرہ بن گیا۔ وہ کہنے لگا کہ دنیا کی کوئی عورت نہ تو یہ مانے گی نہ یقین کرے گی کہ وہ بد صورت ہے، بوڑھی ہے یا غلطی پر ہے۔ مرد کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ اس کی اپنے بارے میں غلط فہمی کو تقویت بخشنے، مجھے علامہ اقبال یاد آگئے جو کہتے تھے:

جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

\*\*\*\*\*

عبدالقادر کے اس معصوم پیار کی متلاشی خاتون کو چکمہ دینے کے بعد ہم خراماں خراماں گفتگو کرتے ہوئے پکنک ایریا کی جانب آگئے۔ یہ ایک چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں تھا جیسے ہی ہم ساحل کے قریب پہنچے عبدالقادر نے مجھے کہنی مار کر بائیں جانب دیکھنے کا اشارہ کیا۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا دکھا رہا مگر ذرا غور کرنے پر دیکھا تو قطار در قطار انسانی جسموں کا ایک شیرازہ بکھرا پڑا تھا۔ یہ وہ افراد تھے جو کالی سمندری کیچڑ میں لتھڑے ہوئے غسل آفتابی کے شوق میں ساکت پڑے تھے۔

وہ کہنے لگا کہ اہل مغرب کا خیال ہے کہ اس سمندر کی کیچڑ اور پانی میں بڑی شفا اور حسن افزا خصوصیات ہیں، یہاں آن کر وہ اس کیچڑ میں لتھڑ جاتے ہیں۔ یہ کیچڑ جب ان پر سوکھ کر ایک مڈماسک بن جاتی ہے تو اوپر ایک قدرتی چشمہ ہے۔ جہاں وہ اسے اپنے گناہ سمجھ کر دھولیتے ہیں۔ تم اگر یہ عمل کرنا چاہو تو بتاؤ۔ مجھے قادر کی آنکھ میں دیکھ کر یقین آگیا کہ یہ اس کی بد معاشیوں کے نئے انداز ہیں۔۔

”نہیں میں رسم و رنیا نبھانے کے لیے بس کچھ دیر تیروں گا یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ پانی کسی کو بھی ڈبو تا کیوں نہیں؟“ میں نے اسے ذرا پرے کیا۔

میں نے پیرا کی کالباس پہنا اور آہستگی سے دنیا کے اس عجیب سمندر میں اتر گیا۔ آپ اگر باقاعدہ دنیا کے مختلف سمندروں میں اس سے پہلے غسل کر چکے ہوں تو آپ کو یہ معلوم ہو چکا ہو گا کہ ہر سمندر اپنے پانی کا کچھ الگ ہی مزاج رکھتا ہے جس میں موسمیاتی اور ماحولیاتی اثرات بہت جدا ہیں۔ بحیرہ ہند کے مڈغسا کر کی ہریالی میں کچھ اور تو ایران کے قریب آن کر کچھ اور مزاج ہوں گے۔ تھائی لینڈ میں اس کی مستی کچھ اور ہوگی، ڈربن جنوبی افریقہ میں اس کے تیور کچھ اور۔ بحیرہ مردار کا پانی مجھے بہت چپ چپا سا لگا جیسے اس میں تیل کی چکناہٹ ہو۔ یہ چلو بھرنے پر دیگر پانیوں کی نسبت گراں بھی محسوس ہوتا ہے۔ میں دور تک چلا گیا اور سمندر گہرا ہوتا گیا مگر یہ کیا جیسے ہی میں نے بیک اسٹروک کیا مجھے لگا کہ میں تو ایک بستر آب پر لیٹا ہوں۔ میں کوئی بہتا ہوا شستیر ہوں۔ میر تقی میر کی طرح میں نے دست طمع دراز کرنے کی بجائے دونوں کو سمیٹ کر سر کے نیچے رکھ لیا۔ پانی میں گناہ گار انگلیوں کی سی گدگداہٹ تھی جو مساج کے وقت محسوس ہوتی ہے بشرط یہ کہ مساج کراتے وقت آپ داتا دربار کے باہر کے میلے غریب غریب مالیشیوں یا استنبول کے گرانڈ بازار کے روایتی ترکی حمام کے کسی پہلوان کے ہتھے نہ چڑھے ہوں۔ مجھے بہت دیر کسی رسیوں کے جھولے hammock کے سے ہلکوروں کا مزہ آتا رہا۔ سینتالیس منٹوں کے بعد جب میں پانی سے باہر آیا تو ساحل پر عبدالقادر فریج سیاہوں کی ایک ٹولی کو لیے بیٹھا تھا جنہیں اس نے بہت کامیابی سے یہ باور کرایا تھا پانی کے حوالے سے میری تحقیقات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور میں نے یہاں کچھ دریا فنتیں بھی کی ہیں جو عنقریب مزید تحقیق کے بعد میں کسی سائنسی جریدے میں شائع کروں گا۔ میں دنیا کا ایک بہت گنی ماہر آب وارضیات پروفیسر ہوں۔ میرے پانی سے باہر آتے ہی وہ میری جانب لپکے۔ قادر نے مجھے آنکھ ماری ایک بوڑھا شخص جو اس گروپ کا سیاح تھا مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے عقیدت سے

دہرا ہو گیا۔ اس نے اپنا نام آندرے بتایا۔ مجھے بے چینی سی ہونے لگی کہ اللہ جانے اس نے انہیں میرے بارے میں جانے کون سے راگ سنائے ہوں گے۔ ایک سایہ دار کیمین میں جب ہم سب بیٹھ گئے تو آندرے پوچھنے لگا۔ اس کا سوال بہت اہم تھا کہ اگر قرون وسطیٰ کے عیسائی یہ سمجھتے تھے کہ یہ ذخیرہ آب اگر اللہ کی جانب سے مطعون اور لعین ہے تو وہ اس پانی کا جو دریائے اردن اس میں گراتا ہے، اس کے بارے میں کیا کہیں گے کیوں کہ اس آب مقدس میں تو حضرت عیسیٰ نے ڈبکیاں لے لے کر یوحنا کے ہاتھوں بتپسمہ لیا تھا یعنی غسل تقدیس۔ اس سوال سے میں یقین جانے کچھ بوکھلا سا گیا لیکن میری اس کیفیت کو بھانپ کر عبدالقادر نے عجیب تو جیہہ یہ کہہ کر پیش کی کہ حیرت کی بات ہے یہی سوال میں نے بھی مقامی عرب ہونے کے ناطے پروفیسر سے پوچھا تھا اور اس کا جواب انہوں نے مجھے یہ دیا تھا۔

اہل عقیدت کو جب اس حماقت کا احساس ہوا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ دریائے اردن کا پانی تو عیسائیوں کے لیے سب سے پاکیزہ ہو ہمارے آب زم زم جیسا اور بحیرہ مردار کا یہ پانی ملعون۔ لیکن پروفیسر نے بتایا کہ یہ پانی جو دریائے اردن کا ہے وہ سمندر کی جانب آتے آتے ہی اس میں گرنے سے پہلے ہی خشک ہو کر ریت میں مل جاتا ہے۔ اس کی یہ وضاحت سن کر عیسائی چہرے شادمان ہو گئے۔ عبدالقادر کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی اور سیاحوں کی آنکھوں میں میری علیست کی دھاک کے حریری پردے جھلملارہے تھے۔

اب کہاں چلیں؟ عبدالقادر نے سگریٹ جلاتے ہوئے پوچھا:

عبدالقادر میں نے سوچا ہے کہ اس خرافات سے بچنے کے لیے آئندہ میں ہر جگہ داخلہ فیس ادا کروں گا۔

آؤ سارہ کا بت نمکین دیکھتے ہیں۔ میں نے تجویز دی۔

وہ کہیں آوارہ گردی کرنے چلا گیا ہے میں ایک سکی امریکی سیاح کے ساتھ دو ہفتے پہلے یہاں آیا تھا۔

ہم پورا دن اس کی تلاش میں نجل خوار ہوتے رہے۔ کئی اور لوگوں سے پوچھا۔ سب نے یہی بتایا کہ سارہ یہاں کئی ہفتوں سے دکھائی نہیں دی۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ بحیرہ مردار کی پاتال میں مدفون اپنے پرانے پڑوسیوں سے گپ شپ کے لیے گئی ہو۔

چلو تو ہم جنوب میں گمراہ اور صدوم کے خرابے کی جانب چلتے ہیں۔





صدوم کی گمراہ کن بستی کی ایک نشانی

میری تجویز پر اس کا چہرہ ایک دم سخت ہو گیا وہاں اس منحوس و ملعون بستی کی جانب آپ کیوں جانا چاہتے ہیں؟ اللہ نے اس جگہ کو مطعون کیا ہے۔ اس بستی پر اللہ کا عذاب آیا ہے۔ ہمارے نبی ﷺ نے وہاں مسلمانوں کو جانے سے روکا ہے۔

عبدالقادر تم جانتے ہو کہ میں تاریخ کا رسیا ہوں۔ میں خود ان بستیوں کی بربادی کا مشاہدہ کر کے ان افراد کو یہ ٹھوک بجا کر باور کرانا چاہتا ہوں کہ یہ کوئی خالی خولی قصے کہانیاں نہیں۔

”چلو ٹھیک ہے۔“ وہ بادل خواستہ میری درخواست پر راضی تو ہو گیا مگر اس شرط پر کہ وہ وہاں سے دور گاڑی کھڑی کریگا اور وہ میرے ساتھ وہاں تک نہیں جائے گا۔ وہاں مجھے پیدل اکیلے ہی جانا ہو گا۔

اس راستے پر چلتے ہوئے میں نے غور سے ایک ایک چٹان اور پتھر یلے وجود کو دیکھا لیکن وہ سارہ نافرمان کا مجسمہ عبرت کہیں دکھائی نہ دیا۔ وہی مجسمہ عبرت جس کے بارے میں عرب مورخ و سیاح مقدسی نے بھی لکھا ہے کہ چالیس فٹ کا وہ بت ایک عرب عورت کا ہیولا لگتا تھا جو خوف، عبرت سکتے اور پشیمانی سے اپنی بستی کو بدترین عذاب میں مبتلا دیکھ رہی ہو۔ پچاس کلو میٹر کے قریب جا کر وہ ایک درخت

کے نیچے رک گیا۔ اب اس مقام سے میں آگے نہیں جاؤں گا۔ اشارہ کر کے مجھے کہنے لگا کہ سیدھے اسی سمت میں دو کلو میٹر جا کر وہ بستی ہے اگر آپ بصد ہیں تو وہاں تک آپ کو پیدل جانا ہوگا۔

میں نے ہمت پکڑی اور چل پڑا۔ سیاحت جو ان مردی کا تقاضا کرتی ہے میرے وہ دوست جو میرے جنون سیاحت پر رشک کرتے ہیں وہ خود اپنے کمرے کے ہاتھ روم تک کا سفر کا بھی رور و کر کرتے ہیں۔ سامنے صحرائی سڑک، سفید اڑتی ہوئی ریت، سورج عین سر پر۔ میں چلا جا رہا تھا۔ میرے پاس بس ایک فون ایک ہیٹ اور پانی کی ایک بوتل تھی۔ ریت پر چلنا کتنا مشکل کام ہے۔ اس کا احساس مجھے اس دن ہوا۔ سفر بلا وجہ طویل لگتا ہے۔ ریت بھی ناہموار ہوتی ہے کہیں گہری تو کہیں واجبی سی۔ ریت میرے جوتوں میں بھی گھس گئی تھی۔ میں نے ورز شاہ اور غذا سے اللہ کی مہربانی سے خود کو بہت فٹ رکھا ہے مگر یقیناً جانیے سوادو کلو میٹر کا یہ سفر میرے لیے بھی آزمائش تھا۔ اب مجھے مٹی کا ایک بہت بڑے پیالے جیسا خرابہ نظر آیا یہاں کوئی بورڈ نہ تھا عرب بدوا سے دشت لوط کہتے ہیں۔ یہاں صرف ٹیلے تھے مجھے لگا کہ ایک بڑے سے ٹیلے کے نیچے وہ سب بد بخت دفن تھے جو حضرت لوط علیہ السلام کے پیغام کا مذاق اڑاتے تھے اور ہم جنس پرستی کی علت میں پڑے تھے یہاں تک کہ اللہ کا عذاب آگیا۔ مقامی بدوا سے دشت لوط کہتے ہیں مگر اسے آپ ایران اور بلوچستان کی سرحد پر واقع صحرا سے کس اپ نہ کریں وہ بھی بہت بے رحم اور بے آب و گیاہ ہے اور دنیا کے پچیس بڑے صحراؤں میں شامل ہوتا ہے۔



دشت لوط

مجھے یقینا خیال آیا کہ میں کسی بے نام بڑی سی قبر پر کھڑا ہوں۔ اللہ جب کسی کو ذلت دے تو اسے کوئی دور نہیں کر سکتا۔ اہل صدوم کی ذلت کی اس سے بڑی کیا علامت ہوگی کہ یہ گناہ ہی اسے شہر کے نام یعنی صدوم سے منسوب ہو گیا ہے۔ انگریزی میں مرد ہم جنس پرست کو Sodomite کہتے ہیں۔ ویرانگی میرے لیے کوئی نئی کیفیت نہیں میرے بے چین قدم مجھے الاسکا امریکا کہ ان سرد مقامات پر بھی لے گئے جن کی بستیوں میں آپ رہیں تو تین ماہ بعد آپ کو سرکار اس قربانی کا باقاعدہ مشاہرہ دیتی ہے۔ میں افریقا کے ان جنگلوں میں بھی گھوما ہوں جہاں سورج کی کرنوں کو درختوں کی شاخوں سے چھن کر آنے میں الجھن ہوتی ہے۔ یقین جانیے جو گھن اور کراہت آپ کو اس مقام پر محسوس ہوتی ہے وہ کہیں بھی شاید نہ ہو۔ جنس کے کاروبار والی ان تجارت گاہوں میں بھی جواب بھی اللہ کے عذاب سے محفوظ ہیں، وہاں بھی

ان کے لعنتی ہونے کا وہ احساس نہیں ہوتا جو اس مقام مکروہ پر ہوا



گندھک کے سلگتے پتھر جن کی آسمان سے برسات ہوئی تھی

\*\*\*\*\*



بجیرہ مردار والے دشت لوط میں میرے لیے وقت گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ چند تصاویر لینے کے بعد میں نے وہاں سے کچھ سنگریزے سمیٹے چونکہ جیب میں ماچس نہ تھی لہذا ان کی آتش زدگی کا جائزہ لینا محال تھا۔ میرے کچھ رفقاء جو پہلے کبھی وہاں گئے تھے وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ کنکر آگ کے قریب آتے ہی بھڑک اٹھتے ہیں۔

واپسی کا سفر اس لیے بھی گراں گزر رہا تھا کہ اس خرابہ جہاں کی گواہی میرے کاندھوں کا بوجھ سی بن گئی تھی۔ عبدالقادر کے پاس پہنچا تو وہ مزے سے ایک درخت کے نیچے کار میں سو رہا تھا۔ میں نے جگایا تو اس نے خاموشی سے کار اسٹارٹ کی مگر جب اس کی نگاہ میرے ہاتھ میں تھامے ہوئے کنکروں پر پڑی جنہیں میں خاموشی سے اپنا سفری تھیلہ کھول کر اندر ڈالنے کا ارادہ کر رہا تھا تو اس کے چہرے پر یکایک کراہتی طاری ہو گئی اور اس نے مجھ سے تحکمانہ لہجے میں پوچھا ”یہ کیا وہاں سے چنے ہوئے سنگریزے ہیں؟“ میں نے جب اثبات میں سر ہلایا تو اس نے یکایک کار کو اتنے زور سے بریک مار کر روکا کہ ٹائر گھسنے کی صدا فضا میں چیخ بن کر گونجی۔ اس نے مجھے انہیں یہیں پر پھینک دینے کا حکم دیا۔ اس کے لہجے میں ایک ایسی وارننگ تھی کہ میں نے فوراً ہی وہ سنگریزے کار کی کھڑکی سے باہر پھینک دیے۔

یہاں ایک عجیب سے ادارک نے مجھے گھیر لیا جو میرے عرب مسلمانوں سے تعلق میں ایک گہرے تجربے کی بنیاد پر ہے۔ عرب مسلمان بھلے سے عمل میں ہمارے برابر یا پیچھے ہوں۔ دین اور اس سے وابستہ قرآنی تصورات اور نظریات کے حوالے سے بہر حال وہ ہم سے بہت کھرے، واضح، سچے اور گہرے ہیں۔ ہمارے ہاں شرک، شخصیت پرستی کی وجہ سے ہم بعض برگزیدہ انسانی ہستیوں کی اپنے کرامات اور قربانیوں کے حوالے سے عیسائی مذہب والا یسوع مسیح کا سادہ دے دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں غیر اللہ کی سمجھ بھی بہت مبہم ہے۔ دینی لحاظ سے ہمارے بہت باعمل افراد بھی ایک اندھی تقلید کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ ملتا جلتا حال ہمارے علماء کا بھی ہے جو اپنے لیے ہمہ وقت توجہی رعایت ڈھونڈتے ہیں۔ عربوں کے ہاں ایسا نہیں وہ دین کو سمجھ کر، ٹھونک بجا کر اپناتے ہیں۔

میں سمجھ گیا کہ عبدالقادر عذاب الہی کی یہ علامات ان بستیوں یا میرے اسباب سفر میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہم نے دس منٹ تک کوئی مزید گفتگو نہیں کی مگر پھر ایک گہری نظر میری جانب ڈال کر وہ گویا ہوا کہ ”میری آپ سے استدعا ہے کہ اللہ نے جن پر لعنت بھیجی اور برباد کر دیا، ان کی نشانیاں ہم اپنی بستیوں میں محض تجسس کی خاطر بھی کیوں لائیں۔“ میں نے وضاحت پیش کی کہ میرا دماغ سائنس اور تاریخ سے بہت کچھ سیکھتا ہے میرے بہت سے دوست ایسے ہیں، جو ان قصوں اور واقعات کو پرانے وقتوں کی تخیلاتی اختراعات سمجھتے ہیں۔ میں انہیں قائل کرنے کے لیے انہیں سمیٹ کر لایا تھا۔

ہم عقیدے کے ایک گہرے سمندر میں حکم الہی سے بہہ رہے ہیں۔ جن کے سوال ہیں وہ اور ان کی سائنس جواب ڈھونڈتے ڈھونڈتے  
جب ایک اندھے کونے میں سر ٹکرانے کے لیے جا پہنچیں گے تو انہیں اپنی سعی ناکام کا خود ہی اندازا ہو جائے گا

”ڈاکٹر صاحب“ عبدالقادر نے بہت دھیمے مشفقانہ لہجے میں کہا۔ ہم عقیدے کے ایک گہرے سمندر میں حکم الہی سے بہہ رہے ہیں۔ جن  
کے سوال ہیں وہ اور ان کی سائنس جواب ڈھونڈتے ڈھونڈتے جب ایک اندھے کونے میں سر ٹکرانے کے لیے جا پہنچیں گے تو انہیں اپنی  
سعی ناکام کا خود ہی اندازا ہو جائے گا۔ آپ ان بستیوں کی نحوست اپنی بستی اور گھروں تک کیوں لے جانا چاہتے ہو؟“

اس نیم خواندہ اسرائیلی عرب ٹیکسی ڈرائیور کے اس مختصر سے بیانیے نے میرے لیے فہم وادارک، شعور و آگاہی کے وہ باب کھول دیے  
جو پہلے نیم مقفل تھے جنہیں میری جانب سے نہ الفاظ، نہ جرات اظہار مل پارہی تھی۔ میں نے جب بھیگے ہوئے عجز سے شکریہ ادا کیا تو اس  
نے میرے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا اور کہنے لگا ”آؤ تمہیں قمران کے غاروں کی طرف لے چلیں۔“



قمران کے غار

ہم خاموشی سے بحیرہ مردار کے شمالی کنارے تک جا پہنچے۔ سڑک کے اختتام پر عبدالقادر نے اپنی کار پارک کی اور ہم سڑک سے نیچے اتر  
کر ساتھ ساتھ تک صحرا میں کوئی دس منٹ تک چلتے رہے یہاں تک کہ ہمارے عین مقابل چونے کے بلند و بالا ٹیلے اور پہاڑیاں دکھائی  
دینے لگے۔ ان پہاڑیوں کی چوٹیوں پر ایسا لگتا تھا کہ کچھ کھڑکیاں بنی ہوئی ہیں۔ یہ دراصل چھوٹے چھوٹے کمرے نما غار یہاں سے قدیم

مذہبی صحائف کا ایک متنازع ذخیرہ ملا ہے جنہیں دنیا Dead Sea Scrolls کے نام سے جانتی ہے۔ یہ متنازع اس لیے ہیں کہ یہ دو طرح کی عبرانی، ایک طرح کی آرمینیائی، ایک طرح کی لاطینی اور عربی زبان میں بھی موجود ہیں۔

ان کی دستیابی بھی قدرت کا ایک انوکھا کارنامہ ہے جس نے دنیائے علم و فکر کے علاوہ عیسائیت اور یہودیت کو بھی ایک بہت بڑے اہتمام رازداری میں جکڑ لیا۔ سن 1946/47 کا زمانہ تھا۔ صحرائے یہود کی ایک ایسی دوپہر جو اپنے جغرافیہ اور ماحول کے حساب سے تو یہاں صدیوں پرانی دوپہروں سے قطعی مختلف نہ تھی مگر اس دن یہاں ایک عجیب اتفاق ہوا۔ قریب کی کسی بستی سے آئے ہو تین چرواہے محمد، خلیل موسیٰ اور جمعہ محمد جو آپس میں کزن بھی تھے، ساری شام مل کر بھیڑیں چراتے رہے۔ شام کو جب انہوں نے گنتی کی تو چرواہا محمد جسے سب عرف عام میں الذہب یعنی بھیڑیا پکارتے تھے اس کی ایک بھیڑ ریوڑ سے غائب تھی۔ اس کی تلاش میں وہ ایک غار کے دہانے پہنچے جو کنواں نما اور گہرا تھا۔ ان تینوں کزنز نے یہ دیکھنے کے لیے کیا غار میں اُترنا محفوظ ہو گا اس کی عمودی گہرائی کا جائزہ لینے کے لیے ایک پتھر پھینکا جو بجائے اس کے کہ تہہ سے ٹکراتا کسی مٹی کے برتن سے ٹکرایا اور وہ ٹوٹ گیا۔



Dead Sea Scrolls

یہ بہ احتیاط اندر اترے اور کچھ مسودات سمیٹ کر وہاں غار سے لے آئے۔ کئی دنوں تک وہ تینوں وہاں سے ملنے والے مسودات کے اوراق اپنے خیموں کے باہر لٹکائے رہے کہ مبادا کوئی گزرنے والا انہیں دیکھ کر صحیح قیمت ادا کر دے۔ جب وہاں کامیابی نہ ہوئی تو وہ اپنے قبیلے کے ایک دانابراہیم کے پاس گئے جس نے ان بوسیدہ اوراق کو دیکھ کر انہیں دفاتر بے معنی کہہ کر مسترد کر دیا۔ ان تینوں کو نہ جانے کیوں یہ یقین تھا کہ یہ کوئی معمولی اوراق پارینہ نہیں۔ یہ انہیں شہر بیت اللحم کے موچی مسٹر کانڈو کے پاس لے گئے جو پیشے سے تو جفت ساز یعنی موچی تھا مگر نوادرات کا کام بھی کر لیا کرتا تھا۔ اس نے ان سب کی قیمت بمشکل سات برطانوی پونڈ ادا کی۔ یروشلم کے ایک قدامت پسند عیسائی راہب یوشے سموئیل نے ان میں سے چار مسودے موچی کانڈو سے سوڈالر میں خرید لیے۔ وہ امریکا منتقل ہوا تو یہ بھی وہاں جا پہنچے جنہیں بالآخر یادین نامی ایک اسرائیلی ماہر آثار قدیمہ نے خرید کے اسرائیلی سرکار کو دے دیے۔ ان دنوں یہ اسرائیل کے کسی عجائب گھر میں نمائش کے لیے رکھے گئے ہیں۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ ڈھائی لاکھ ڈالر کی وہ رقم اسے اس لیے پوری نہ مل پائی کہ ان کو

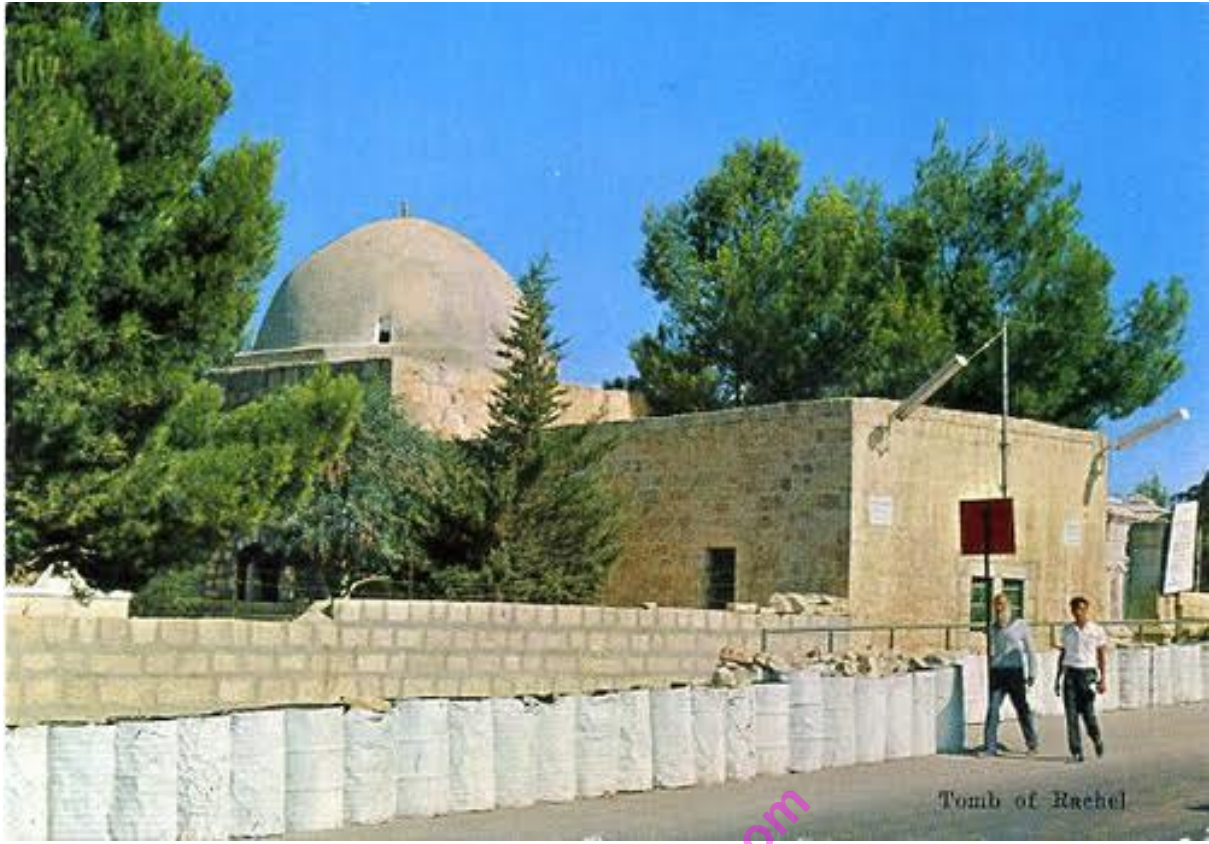


ملک میں لاتے وقت عیسائی پادری نے ان کی کسٹمز کو مطلع نہ کیا تھا۔ یہ قصہ جب عام ہوا تو بہت سارے خزانے کے کھوجی وہاں قبران کے غاروں تک پہنچ گئے۔ انہیں مسودوں میں کپڑے سے بنے ہوئے کاغذ، جانوروں کی کھالوں پر کچھ اہم زیر زمین مقامات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ایک نقشہ تو تانبے کی پلیٹوں پر بھی منقش ہے۔ آخر الذکر اس لیے بہت اہم اور خفیہ ہے کہ اس میں ان 64 مقامات کی نشاندہی کی گئی ہے جہاں خزانے مدفون ہیں۔

تلاش بسیار کے بعد بھی یہ خزانے برباد ہیکل سلیمانی کی تہہ خانوں سے نہیں مل پائے۔ کچھ حلقوں کی جانب سے یہ الزام بھی بہت تواتر سے لگایا جاتا رہا ہے کہ شاید یہ خزانے ان Templar Knights نے چرا لیے جنہیں پاپائے روم کے حکم پر ہیکل سلیمانی کی بربادی اور یروشلم پر اہل یہود کے اقتدار پر خاتمے یعنی پہلی صدی عیسوی پر یہاں مسجد الاقصیٰ القدیم میں ٹھہرایا گیا۔

ان قدیم مسودات کی تاحال تعداد 938 تک جا پہنچی ہے۔ ان میں قدیم ترین مسودہ دو ہزار سال پرانا ہے۔ ان اوراق میں مکمل توریت یعنی عہد نامہ عتیق یا Old Testament موجود ہے جسے ایک یہودی قبیلے کے افراد Essenes نے حضرت عیسیٰؑ کی آمد سے تین سو سال پہلے تحریر کیا۔ اس میں صرف ان کی کتاب Esther غائب ہے جس میں یہودیوں کے لیے حضرت عیسیٰؑ کی اطاعت لازم قرار دی گئی اور یوں یہ سلسلہ دراز ہو کر دین اسلام کی پیروی تک آن پہنچتا ہے۔ شیخ احمد دیدات صاحب کے علم میں یہ بات لائی گئی تھی کہ ان میں بائبل کا وہ حذف شدہ حصہ بھی موجود ہے جس میں Paracletos یعنی ایک فارقلیط بمعنی ایک نجات دہندہ کہہ کر پکارا گیا اور اس عالی مرتبت ہستی کی آمد کا خردہ سنایا ہے۔ اس حصہ کی تمام تر علامات ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی نبوت سے متعلق ہیں۔

کچھ عرصے قبل تک تو ان غاروں تک سیاح کو جانے کی اجازت تھی مگر پھر ان جگہوں پر حادثات ہونے لگے اور حکومت کی جانب سے پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ وہ تینوں کزنز جنہوں نے اسے دریافت کیا غربت کا ہی شکار رہے، دو تو اس جہان فانی سے سدھار گئے ہیں البتہ جمعہ محمد اب بھی جیریکو کے قریب ایک چھوٹی سی بستی میں گمنام زندگی گزار رہا ہے۔



### حضرت راحیل کا مقبرہ

قمران سے چلے تو سورج آسمان سے قہر برسا رہا تھا۔ دن بھر سے ہم نے کچھ کھایا پیا بھی نہ تھا۔ ایسے میں قادر کو حضرت راحیل (Rachel) کے مرقد مبارک کی زیارت کی سوچھی۔ آپ حضرت یعقوب علیہ السلام کی چھوٹی بیوی اور حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائی بن یامین کی والدہ محترمہ تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم یروشلم واپسی سے پہلے یہ زیارت بھی کر لیں۔ تینوں مذاہب یعنی اسلام، عیسائیت اور یہودی ان میں حضرت یوسف علیہ السلام کی مردانہ وجاہت اور جمال دل نشین کے بارے میں بیک زبان اتفاق ہے۔ صحیح مسلم کی حدیث اس طرح سے بیان کرتی ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے فرمایا کہ ”جب ان کی ملاقات معراج پر حضرت یوسف علیہ السلام سے ہوئی تو مجھے ایسا لگا کہ دنیا کا سارا حسن اگر دو برابر حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تو نصف کے حق دار صرف حضرت یوسف علیہ السلام ہوں گے اور بقایا نصف ساری دنیا کے حصے میں آیا ہے۔“ ان کے حسن کا بہت غالب حصہ انہیں اپنی والدہ محترمہ سے ملا تھا گو کسی جگہ یہ مذکور نہیں کہ حضرت راحیل خود بھی حسن و جمال میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں۔ ان کا انتقال بیت اللحم جاتے ہوئے عین اس مقام پر ہوا تھا۔ اہل یہود کے ہاں وہ مادر بنی اسرائیل کے طور پر بہت تقدیس و تحریم کے لائق سمجھی جاتی ہیں۔

اہل یہود کے مذہبی لٹریچر میں ایک روایت کے بموجب جب حضرت یوسف علیہ السلام قافلے سے دامن چھڑا کر بھاگ کر اپنی والدہ کے مرقد پر پہنچے اور انہوں نے پکارا کہ ”ماں یہ مجھے کہاں زبردستی اپنے فائدے کے لیے لئے جاتے ہیں؟“ تو مرقد سے آواز آئی تھی کہ ”میرے لخت جگر تمہارا ان کے ساتھ چلے جانا ہی تمہارے لیے رہتی دنیا تک باعث توصیف و عظمت بنے گا۔ اہل یہود کے ہاں جب کبھی

یہودیوں پر مشکلات نازل ہوئیں تو وہ اپنی دادرسی کے لیے مادر بنی اسرائیل کی جانب بھاگے۔ انہیں وہ بے اولادوں کے لیے مرکز بار آوری بھی سمجھتے ہیں۔

قواعد اور نقشوں کی رو سے یہ مرقدِ عالیہ ویسے تو دریائے اردن کے مغربی کنارے یعنی فلسطین کی ریاست کا حصہ ہے لیکن ان کے دین میں اس کی ناقابل گریز اہمیت کے پیش نظریوں لگتا ہے کہ اسرائیل نے بھی ہمارے کے ڈی اے اور کے ایم سی کے محکمہ اراضی اور ان کے نقشہ سازوں سے متاثر ہو کر ایک چائنا کنگنگ کر کے اسے بھی اسرائیل میں داخل دفتر کر دیا گیا ہے۔ اس سلیقے سے کہ کسی دیہاتی حسینہ کے بالوں کی مانگ کی مانند ایک تنگ سی لکیر اب اسرائیل کا علاقہ ہے۔ اس کی اوسط رقبہ کی عمارت جسے اسرائیلیوں کی دوسری اہم مقدس عمارت سمجھا جاتا ہے، اسے ہر طرف سے مسلح اسرائیلی سپاہیوں نے اپنے نرغے میں لے رکھا ہے۔ دو عدد واپچ ٹاوروں پر بھی ان کے چاک و چوبند سنتری ایستادہ رہتے ہیں۔

میرے مشاہدے میں یہ ایک عجیب بات آئی کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کی آنکھیں جتنی جلدی کسی بھی مرقد اور بزرگ ہستی کے ذکر غم انگیز پر رور و کر سوچ جاتی ہیں، یہودیوں کے ہاں یہ معاملہ صرف دیوار گریہ تک محدود ہے۔ وہ ان مزارات یا ان ہستیوں کے دکھ بھرے تذکروں پر ہر گز نہیں روتے۔ ان مواقع اور مقامات پر ایک پروتار خاموشی ان کا وطیرہ رہتی ہے۔ ہاں البتہ ان مزارات پر وہ ہل ہل کر توریث ضرور پڑھتے ہیں۔ ہل ہل کر کسی مقدس کتاب کی تلاوت پر مجھے وہ چھ سالہ بچی یاد آئی جو پہلی دفعہ ناروے سے لہستی بختاں والا سرگودھا اپنی بی ایریا لیاقت آباد کراچی والی امی جان کے ساتھ آئی تھی۔ صبح سویرے جب اس نے اپنی جائے نماز پر دادی کو زور زور سے ہل ہل کر قرآن پڑھتے دیکھا تو اس کا رخیر کی وضاحت اپنی انگارہ بر زبان ماں سے چاہی۔ جس نے اسے بہت پیار سے سمجھایا کہ ”بیٹا تمہاری دادی اماں اپنے فائنل امتحان کی تیاریاں کر رہی ہیں۔“

\*\*\*\*\*



حضرت راحیل، حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ محترمہ تھیں۔ ان کے مرقد عالیہ کے احاطے میں وہاں موجود ایک یہودی خاتون کچھ ورد کرتے ہوئے ایک اونی سرخ دھاگے کو مرقد کے گرد لپیٹ کر اس میں پھونک پھونک کر گرہیں باندھ رہی تھی۔ اسے وہ بہت احتیاط سے لپیٹ کر ایک چھوٹے سے پرس میں بھی رکھ رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ شاید اسے وہ ایسی خواتین کی کمر کے گرد باندھتی ہیں جن کو بچے کی ولادت کے درد میں کمی اور زچہ کو آرام پہنچانا مقصود ہو۔

ہم وہاں سے فاتحہ خوانی کے بعد واپس یروشلم لوٹ آئے۔ میں مسجد اقصیٰ کے قریب اتر گیا۔ عبدالقادر بھی دن بھر کی مسافت سے ہلکان ہو گیا تھا اور گھر جا کر آرام کرنے کا متمنی تھا۔ اس نے جب کل کا پروگرام پوچھا تو میں نے کہا الخلیل یعنی ہیبرون۔ یہ نام سنتے ہی وہ ایک دم متفکر سا ہو گیا۔ اس نے یقین دہانی کی خاطر پوچھا کہ ”کیا میں واقعی ہیبرون جانا چاہتا ہوں۔ یہ جانتے بوجھتے بھی کہ ہمہ وقت یوٹیوب اور دنیا بھر کا میڈیا وہاں ہنگاموں اور مار دھاڑ کی خبریں دکھا رہا ہوتا ہے؟“ میں نے بھی ذرا حوصلہ دکھاتے ہوئے جواب دیا ”جی ہاں میرا حضرت علی مرتضیٰ کے اس قول پر بہت پختہ یقین ہے کہ موت ہی زندگی کی محافظ ہے۔ اسی وجہ سے سیاحت میں میری دل چسپی ناقابل سمجھوتہ ہے۔“ ”تو پھر کل صبح چھ بجے تیار رہنا۔“ یہ کہہ کر وہ رخصت ہو گیا اور میں اس کی کاریر و شلم کے خراماں ٹریفک میں آہستگی سے غائب ہوتی دیکھتا رہا۔ میں بھی ان تنگ گلیوں میں ٹکراتا، بھاگا بھاگا سا بڑھتا رہا۔ دکاندار، وہی مال و منال کے سودوں میں مصروف تھے۔ چیک پوسٹوں والے بھی اب کچھ صورت شناسا سے ہو گئے تھے اور مجھے مغرب کے لیے مسجد اقصیٰ میں جماعت مل گئی۔

میرا ارادہ یہ تھا کہ صلوٰۃ المغرب کے بعد حاتم، نبیل انصاری یا شیخ نائف کے ساتھ اپنے مذاکرات جاری کر کے علم کی پیاس بجھاؤں گا مگر وہ کہیں دکھائی نہ دیے۔ مجھے یکایک یاد آیا کہ آج تو جمعرات ہے اور وہ سب مسجد رابعہ میں ذکر کی محفل برپا کر کے بیٹھے ہوں گے۔

جوڈاس کو جب یہ علم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مصلوب کر دیے گئے ہیں تو بہت دل گرفتہ ہوا۔ وہ اس مقام پر آیا اور اپنی رشوت کی رقم راہب کے سامنے مٹی پر پھینک دی اور باہر جا کر ایک چبوترے پر خودکشی کر لی۔ بائبل میں متی اور لوکا کا بیان ایک دوسرے سے اس حوالے سے قطعی مختلف ہے۔

مغرب سے عشاء کے درمیان میرا کلینک بھی ہو گیا تو میرے پاس کچھ اور مصروفیت نہ تھی۔ یروشلم میں چھ سو میٹر کا ایک پتھر والا، بل کھاتا راستہ ہے جو بیچ بازار سے گزرتا ہے۔ اسے عرب طریق الام یعنی شاہراہ کرب کہتے ہیں۔ اس شاہراہ کی تصدیق عیسائیوں کے تمام فرقے کرتے ہیں۔ ان سب کا اتفاق اس پر بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ کی گرفتاری Garden of Gathsheme کے عین اُس مقام سے ہوئی تھی جہاں آج کل چرچ آف آل نیشنز یا کلیسیہ آلام موجود ہے۔

چاروں بانبلوں میں یعنی متی، لوکا، یوحنا اور مارکس میں اس رات کا احوال ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ جن لمحات میں حضرت عیسیٰ اپنے گیارہ حواریوں کے ساتھ وہاں سے فرار ہوئے تھے تو بارہواں حواری Judas Iscariot، غائب تھا۔ وہی دغا باز، رومی سپاہیوں اور یہودی راہبوں کو لے کر وہاں پہنچا۔ مرحلہ شناخت کا تھا۔ لہذا طے ہوا تھا کہ ان حواریوں میں مروج رسم کے مطابق یہ بد بخت جس ہستی کو چومے گا۔ وہی حضرت عیسیٰ ہوں گے۔ اسی وجہ سے انگریزی زبان میں بظاہر پیار کا وہ عمل جو دھوکا دہی کی نیت سے کیا گیا ہو اسے Judas of a kiss کہتے ہیں۔ اسے حضرت عیسیٰ کو پکڑوانے کی رشوت چاندی کے چالیس سکے ملی تھی۔



الخلیل

جوڈاس کو جب یہ علم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مصلوب کر دیے گئے ہیں تو بہت دل گرفتہ ہوا۔ وہ اس مقام پر آیا اور اپنی رشوت کی رقم راہب کے سامنے مٹی پر پھینک دی اور باہر جا کر ایک چبوترے پر خودکشی کر لی۔ بانبیل میں متی اور لوکا کا بیان ایک دوسرے سے اس حوالے سے قطعی مختلف ہے۔

حضرت عیسیٰ کی گرفتاری، مقدمے، سزا کے حوالے سے بہت تحقیق ہوئی ہے۔ انہیں جمعہ کی اس رات ایک سے دو بجے کے درمیان گرفتار کیا گیا تھا۔ کل چھ مقدمے چلے جن میں تین یہودی قانون کے مطابق اور تین رومن قانون کے مطابق تھے۔ الزامات یہ تھے کہ وہ خود کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ مملکت روم سے بھی وفادار نہیں اور یہودی مذہب کی بھی توہین کرتے ہیں۔

یہ الزامات ایسے نہ تھے کہ جس کی وجہ سے انہیں مصلوب کیا جاتا۔ آخر کار انہیں رومی گورنر Pilate یعنی کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہ سیاسی مقدمہ سابن گیا اور وہ اتنی کڑی سزا کے حق میں نہ تھا۔ اس کی بیوی بھی انہیں معافی دینے کے حق میں تھی لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ یروشلم کے عوام کو حضرت عیسیٰ کے خلاف بہت مشتعل کیا گیا تھا، وہ اس بات پر رضامند نہ تھے کہ ان کی جان بخشی کی جائے۔ پیلطس نے

اپنے تئیں کچھ قانونی مویشی گانیوں کا سہارا لینا چاہا۔ اس نے تجویز دی کہ مصلوب کرنے کی بجائے حضرت عیسیٰ کو چالیس کوڑوں کی سزا دے کر رہا کر دیا جائے۔ اس وقت جب گورنر نے یہ تجویز یروشلم کے بپھرے ہوئے عوام کے سامنے رکھی تو وہ مزید مشتعل ہو گئے جس پر اس نے اپنا آخری قانونی پتہ پھینکا۔

یروشلم کے گورنر کو اختیار تھا کہ وہ Passover کے اس مقدس دن (جو یہودیوں کے موسم بہار کا ہفتہ جشن ہے جسے وہ فرعون سے غلامی کے نجات کی یاد میں مناتے ہیں) کسی بھی ایک قیدی کی مکمل سزا کو معاف کر سکتا تھا۔ اس دن ایک بے رحم قاتل Barabbas اور حضرت عیسیٰ میں سے کسی ایک کو معاف کیا جاسکتا تھا۔ کیونکہ باراباس کی سفاکیت اور جرائم پیشہ زندگی سارے یروشلم کے سامنے تھی لہذا نمونے کے طور پر پہلے اسے اور بعد میں حضرت عیسیٰ کو عوام کے سامنے پیش کیا گیا۔ خلق یروشلم نے معافی کی رعایت اس قاتل باراباس کو دی۔ حضرت عیسیٰ کے بارے میں ان کا غم و غصہ برقرار رہا اور ان کے مصلوب کیے جانے کی سزا برقرار رہی۔ خلق خدا کا یہ ظالمانہ فیصلہ سن کر حضرت عیسیٰ مسکرا دیے اور سر تسلیم خم کر دیا۔

آخر کار فیصلے پر عمل درآمد کی گھڑی آگئی۔ حضرت عیسیٰ صلیب لے کر اس طریق آلام یعنی Via Dolorosa پر جمعہ کے دن تین بجے چل پڑے۔ اس واک کی یاد میں اب یہاں ہر جمعہ کو ٹھیک تین بجے ایک محفل عزاداری منعقد ہوتی ہے۔ اس طریق آلام کے کل چودہ پڑاؤ ہیں۔ انیسویں صدی کے آغاز سے مختلف تحقیقات کے بعد اس موجودہ راستے کو مستند مان لیا گیا جو 600 میٹر طویل ہے اور قلعہ انطونیو سے کنسیہ القائمہ تک چلا جاتا ہے۔ ہر پڑاؤ سے منسوب اپنی ایک داستان کرب و الم ہے۔

میرا اصل ارادہ تو یہ تھا کہ میں الخلیل یعنی Hebron سے واپسی پر ان عزاداروں کے ماتمی جلوس میں شریک ہوں گا مگر مجھے پھر خیال آیا کہ جانے پھر یہ موقع ملے نہ ملے۔ میں دو سو میٹر کے لگ بھگ چل کر اپنے ہوٹل والی شاہراہ پر جا رہا تھا تو میری نگاہ دو عدد کیتھولک راہباؤں پر پڑی جو دو تنگ گلیوں کے سنگم پر سرنگوں کھڑی تھیں۔ ایک کونے پر کانسی کی ایک تختی بھی نصب تھی جس پر بہت واضح طور پر VIA Dolorosa ”لکھا تھا۔ میں بھی ان کے پاس پہنچ گیا اور بات چیت سے معلوم ہوا کہ وہ اس ماتمی جلوس میں شریک ہونے آئی ہیں جو ان چودہ مقامات آہ و بکا سے گزرے گا۔

میرے اس سوال پر کہ ”کیا میں بھی اس سلسلہ عزاداری کا حصہ بن سکتا ہوں حالانکہ میں ایک مسلمان ہوں؟“ تو ان میں سے جو عمر رسیدہ تھی وہ ہنس پڑی اور کہنے لگی کہ ”ہم سب اُس ایک ہی شعور الہی کا حصہ ہیں۔“ عیسائیوں کی مقدس ترین مسافت یا تیراکا ایک رکن یہ ہے کہ اس طریق آلام کا سفر کریں۔ دوسرے دریائے اردن جہاں حضرت عیسیٰ نے ڈبکی لگا کر بتپسمہ لیا تھا، اسی مقام پر وہ بھی غسل تقدیس کریں۔

\*\*\*\*\*



کچھلی قسط میں اس طریق الامام یعنی شاہراہ کرب کا ذکر تھا۔ (اس سے متعلق تفصیلات کچھلی قسط میں کچھ دے دی گئی تھی مگر اس کے اگلے حصے سے مربوط ہونے کے لیے دوبارہ اپنے ذہنوں میں تازہ کر لیجیے۔) اس شاہراہ کی تصدیق عیسائیوں کے تمام فرقے کرتے ہیں۔ ان سب کا اتفاق اس پر بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ کی گرفتاری Garden of Gathsheme کے عین اُس مقام سے ہوئی تھی جہاں یہ چرچ آف آل نیشنز یا کلیسیہ آلام موجود ہے۔ چاروں بائبلوں میں یعنی متی، لوقا، یوحنا اور مارکس میں اس رات کا احوال ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ جن لمحات میں حضرت عیسیٰ اپنے گیارہ حواریوں کے ساتھ وہاں مفرور تھے تو بارہواں حواری Judas Iscariot غائب تھا۔ وہی دغا باز، رومی سپاہیوں اور یہودی راہبوں کو لے کر وہاں پہنچا۔ مرحلہ شناخت کا تھا، لہذا طے ہوا تھا کہ ان حواریوں میں مروج رسم کے مطابق یہ بد بخت جس ہستی کو چومے گا وہی حضرت عیسیٰ ہوں گے۔ اسی وجہ سے انگریزی زبان میں بظاہر پیار کا وہ عمل جو دھوکا دہی کی نیت سے کیا گیا ہوا اسے kiss of Judas کہتے ہیں۔ اسے حضرت عیسیٰ کو پکڑوانے کی رشوت چاندی کے چالیس سکے ملی تھی۔ آج کل اس مقام پر ایک چرچ موجود ہے جس کا نام کلیسیہ آلام یا Church of All Nations کے نام سے پکارا جاتا ہے۔



وہ چبوترہ جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے گرفتاری سے قبل عبادت کی

جوڈاس کو جب یہ علم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مصلوب کر دیے گئے ہیں تو بہت دل گرفتہ ہوا۔ وہ اس مقام پر آیا اور اپنی رشوت کی رقم راہب کے سامنے مٹی پر پھینک دی اور باہر جا کر ایک چبوترے پر خودکشی کر لی۔ بابل میں متی اور لوکا کا بیان ایک دوسرے سے اس حوالے سے قطعی مختلف ہے۔



کلیسہ آلام

حضرت عیسیٰ کی گرفتاری، مقدمے اور سزا کے حوالے سے بہت تحقیق ہوئی ہے۔ انہیں جمعہ کی اس رات ایک سے دو بجے کے درمیان گرفتار کیا گیا تھا۔ کل چھ مقدمے چلے جن میں تین یہودی قانون کے مطابق اور تین رومن قانون کے مطابق تھے۔ اُن پر الزامات یہ عائد کیے گئے تھے کہ وہ خود کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ مملکت روم سے بھی وفادار نہیں اور یہودی مذہب کی توہین کرتے ہیں۔ یہ الزامات ایسے نہ تھے کہ ان کی وجہ سے انہیں مصلوب کیا جاتا۔ آخر کار انہیں رومی گورنر Pilate یعنی پیلاطس کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہ سیاسی مقدمہ سا بن گیا اور وہ اتنی کڑی سزا کے حق میں نہ تھا۔ اس کی بیوی بھی اسے معافی دینے کے حق میں تھی لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ یروشلم کی رعایا اس بات پر رضامند نہ تھی۔





وہ چہوترہ جہاں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کیا گیا

یروشلم کے گورنر کو اختیار تھا کہ وہ اس مقدس دن Passover یعنی جس دن یہودیوں کو فرعون سے نجات ملی تھی کسی بھی ایک قیدی کو معاف کر سکتا تھا۔ اس دن ایک بے رحم قاتل Barabbas اور حضرت عیسیٰ کو ان دو میں سے کسی ایک کو معاف کیا جاسکتا تھا کیونکہ باراباس کی سفاکیت اور جرائم پیشہ زندگی پورے یروشلم کے سامنے تھی لہذا نمونے کے طور پر پہلے اسے اور بعد میں حضرت عیسیٰ کو عوام کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ لوگ جو خلق خدا پر اللہ سے زیادہ بھروسہ کرتے ہیں وہ جان لیں کہ خلق خدا نے قاتل کو معاف اور نبی معصوم کو مصلوب کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس کا نام دنیا ہے۔ عوام کا مطالبہ سن کر حضرت عیسیٰ نے مسکراتے ہوئے ایک ہی جملہ کہا تھا

Forgive them. They knoweth not (الہی انہیں معاف کر دے، یہ لاعلم ہیں)۔ حضرت عیسیٰ آخر کار اپنی صلیب لے کر اس طریق آلام پر جمعہ کے دن تین بجے چل پڑے۔ اس واک کی یاد میں اب یہاں ہر جمعے کو ٹھیک تین بجے ایک تقریب منعقد ہوتی ہے۔ اس طریق آلام کے پہلے چودہ پڑاؤ ہوتے تھے اب یہ کل نو ہیں۔ انیسویں صدی کے آغاز سے مختلف تحقیقات کے ذریعے موجود راستے کو مستند مان لیا گیا جو 600 میٹر طویل ہے اور قلعہ انطونیو سے کنسیہ القائمہ تک چلا جاتا ہے۔ ہر پڑاؤ کی اپنی داستان کرب و الم ہے۔ میرا اصل ارادہ تو یہ تھا کہ میں الخلیل یعنی Hebron سے ان عزاداروں کے ماتمی جلوس کا حصہ بنوں گا مگر مجھے پھر خیال آیا کہ جانے پھر یہ موقع ملے نہ ملے۔ سو اپنا ارادہ بدلا، ویسے بھی میری نگاہوں کے سامنے پہلے پڑاؤ کا بورڈ لگا تھا۔ میں نے ان میں سے ایک راہبہ کو پوچھا کہ ”کیا میں بھی ان کے ساتھ Via Dolorosa کے اس سلسلہ عزاداری کا حصہ بن سکتا ہوں حالانکہ میں ایک مسلمان ہوں؟“ تو



ان میں سے جو عمر رسیدہ تھی وہ ہنس پڑی اور کہنے لگی کہ ”ہم سب اس ایک ہی شعور الہی کا حصہ ہیں“۔ عیسائی حج کا ایک رکن یہ ہے کہ اس طریق الامام کا سفر کریں، دریائے اردن جہاں حضرت عیسیٰؑ نے ڈبکی لگا کر بتپسمہ لیا تھا وہیں وہ بھی غسل تقدیس کرے۔ پہلا پڑاؤ وہ مقام ہے جہاں مقدمے کا فیصلہ سنایا گیا اور ان پر رومی سپاہیوں کی جانب سے بے انتہا تشدد کیا گیا۔ اس دوران عوام کی ایک خاصی بڑی تعداد بھی ان کا مذاق اڑا کر ان کے ارد گرد ناچتی کودتی رہی۔ دوسرے پڑاؤ سے آپ نے اپنی صلیب اٹھائی اور آپ کے سر پر کانٹوں کا تاج پہنایا گیا۔ ایک عدد کانٹا زور سے آپ کے رخسار مبارک پر اور کچھ آپ کی پیشانی پر بھی چھ گئے۔ ان خراشوں سے خون رسنے لگا۔ تماش بین آپ کی تضحیک کرتے ہوئے ’یہودیوں کے بادشاہ کی آمد۔ مرحبا مرحبا‘ کے نعرے لگاتے رہے۔



طریق الامام تیسرا پڑاؤ

تیسرے پڑاؤ پر ایک چھوٹا سا خوبصورت آرمینی چرچ موجود ہے۔ حضرت عیسیٰ اس مقام پر تشدد اور تھکاوٹ سے صلیب کے بوجھ سے نڈھال ہو کر گر پڑے تھے۔ چوتھے پڑاؤ پر چونکہ اس دن یہودیوں کا مقدس تہوار پاس اور تھا لہذا ایک مجمع سڑک کے اطراف موجود تھا۔ رومی سپاہی آپ پر کوڑے برساتے جاتے تھے۔ اتنے میں اس مقام پر حضرت مریم مجمع کو چیرتی ہوئی باہر نکلیں۔ دونوں ماں بیٹوں نے ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھا، ماں نے بیٹے کے چہرے کے زخم پونچھے لیکن سپاہیوں نے ایک زور کوڑا حضرت عیسیٰ کو رسید کیا اور مسافت اندوہ جاری رکھنے کا حکم دیا۔

پانچویں پڑاؤ سے ایک ڈھلان کا آغاز ہو جاتا ہے جو اس ٹیلے کی جانب اٹھتی چلی جاتی ہے جسے عربی میں ال جل جثہ اور انگریزی میں Golgotha کہتے ہیں۔ یہاں یہ بیان دل چسپی سے خالی نہ ہو گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اکہرے بدن کے تھے۔ ان کے لیے اتنی بھاری صلیب لے کر چٹان پر چڑھنا آسان نہ تھا۔ وہ بہت قلیل الطعام (کم خوراک) اور قلیل المنام (کم نیند والے) تھے، جبکہ صلیب کا اپنا ہی وزن ایک سو تیس کلو گرام کے لگ بھگ تھا۔

تیسرے پڑاؤ سے ہی میری ہم قدم ان اطالوی راہبائیں کی آہوں کا آغاز ہو چکا تھا جو یہاں تک پہنچ کر باقاعدہ سسکیوں اور آہ وزاری میں بدل گیا۔ ان کے لیے اب اس عمودی ڈھلان اور سیڑھیوں پر چڑھنا مشکل ہو رہا تھا۔ سانس بھی پھولنے لگی تھی ایسے میں اس عمر رسیدہ راہبہ نے میرا بڑھایا ہوا ہاتھ شکریے سے تھام لیا۔ انہیں رومن سپاہیوں میں میری طرح کانیک دل سائنمن سرین تھا جس نے حضرت عیسیٰ کو اس مقام پر صلیب اوپر تک ڈھونے میں مدد کی۔ چھٹے پڑاؤ پر حضرت ورونیکا آگے آئیں اور اپنے رومال سے حضرت عیسیٰ کے چہرہ مبارک سے خون صاف کیا۔ یہ رومال آج بھی پوپ کی راجدھانی وٹیکن کے کلیسا 'Saint Peter's Basilica, Rome' میں موجود ہے۔ خاکسار اس کی زیارت باسعادت سے بھی مستفید ہو چکا ہے ساتویں پڑاؤ پر حضرت عیسیٰ ایک مرتبہ پھر سے نڈھال ہو کر گر پڑے۔

آٹھویں پڑاؤ سے جہاں آج کل ایک چھوٹی مگر مصروف مارکیٹ ہے وہاں سے گزرتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نگاہ آہ و بکا میں مصروف چند خواتین پر پڑی یہ آپ کی خفیہ پیروکار تھیں۔ آپ نے یہاں رک کر ایک چھوٹا سا خطبہ ارشاد فرمایا۔ یہاں آپ پر ایک دفعہ پھر سے کوڑے برسائے گئے۔ نواں پڑاؤ وہ ہے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام تیسری مرتبہ گرے۔ یہاں سے ایک اندھا موڑ آتے ہی سیدھے ہاتھ پر کنسیہ القائمہ یعنی Church of the Holy Sepulchre آ جاتا ہے۔ اس کی ان عیسائیوں کے ہاں بلحاظ تقدیس وہ اہمیت ہے۔



### کنسیہ القائمہ

طریق الام کے بقایا چار پڑاؤ اسی کلیسا کے احاطے میں ہیں جنہیں رومی شہنشاہ کانستانتائن نے بنایا تھا۔ اسی کے عہد میں عیسائیت کو بہت فروغ ہوا۔ ایک روایت کے بموجب وہ صلیب جو ان کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ کو مصلوب کرنے کے وقت استعمال ہوئی اسے اس کی والدہ نے کھوج نکالا تھا۔ یہ صلیب نائٹ ٹمپلز چرا کر اسکاٹ لینڈ لے گئے تھے اب یہ اسکاٹ لینڈ کے روزالن چرچ میں چھپا کر رکھی گئی ہے۔ (خاکسار پچھلے دنوں ایک پیشہ ورانہ کانفرنس میں اسکاٹ لینڈ گیا تو اس کی زیارت کا بھی شرف حاصل ہوا۔ یہ قصہ کسی اور وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔) کنسیہ القائمہ میں مین گیٹ کے ساتھ پڑاؤ نمبر دس ہے۔ یہاں مزید تحقیر کے لیے حضرت عیسیٰ کو برہنہ کر دیا گیا تھا۔

مجھے لگا کہ میں تو اپنے عقیدے کی رو سے یہ مصلوب ہونے والی غلطی عام داستان ام اور اس طرح کی دور افتادہ عزاداری سے بالکل ہی لاتعلق ہوں۔ اس کے باوجود میں نے جذبات انسانی کے احترام میں ان کی رفاقت اس وقت تک نبھائی جب تک لائن مارشل نے ہمیں باہر نہ کر دیا

وہ اس حالت برہنگی میں چند قدم آگے لے جائے گئے اور ایک ہال میں داخل ہوئے۔ یہ ہال شاید وہ مقام ہے جسے لاطینی میں cavalry اور یونانی زبان میں اسے Golgotha کہتے ہیں عربوں نے بھی اسی یونانی لفظ کو مشرف بہ عربی کر کے ال جل جشہ پکارنا شروع کر دیا ہے۔ یہ وہ جائے عبرت تھی جہاں مجرموں کو کڑی سزائیں دی جاتی تھیں۔ ہم اس مقام پر جب پہنچے جہاں حضرت عیسیٰ مصلوب ہوئے تھے تو رات ہو چکی تھی۔ ہال میں تھوڑے سے افراد تھے اس مقام پر جہاں حضرت عیسیٰ مصلوب ہوئے اب ایک صلیب پر ہالو گرافک عکس موجود ہے۔ اب میری ہم سفر راہبائیں غم سے نڈھال ہو کر گھٹنوں کے بل گر پڑی تھیں اور روئے چلی جاتی تھیں۔ ان کا غم سمجھ بھی سکتا ہوں اور اس پوری تاریخ سے بھی کما حقہ آگاہ ہوں۔ ان کے عقائد سے اختلاف رکھنے کے باوجود میں ان کے جذبات کا مکمل احترام کرتا ہوں۔



میرے عقیدے کی راہیں جدا ہوئیں تو میں نے ان مبتلائے درد و الم بیبیوں کو سسکتا بلکتا چھوڑا اور چل پڑا۔ سیڑھیاں اتر کر چرچ کے مین ہال میں ایک گول سے پلیٹ فارم پر وہ سنگ مسیحائی ہے جہاں حضرت عیسیٰ کا جسد مبارک بی بی مریم کی گود میں رکھا تھا۔ وہ اشکبار تھیں۔ اس پتھر کے عین اوپر تصاویر کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے ایک میں بے جان عیسیٰ ابن مریم کو والدہ کی گود میں پڑا دکھایا گیا ہے۔



کنسیۃ القائمہ کے اندر

یہاں وہ مرقد ہے جس میں حضرت عیسیٰ کو دفن کیا گیا تھا۔ دن میں لمبی قطاریں ہوتی ہیں مگر رات کو تھوڑے سے لوگ تھے سو میرا نمبر جلد ہی آگیا۔ لائن چل رہی تھی اور میں بھی شیشے کے سے چمکتے خوب صورت موزائیک فلور پر آگے بڑھتا رہا۔ دیواروں پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام، جنت، فرشتوں کی تصاویر آویزاں تھیں۔ داخلے کے دروازے پر بیس فٹ کے قریب اونچی موم بتیاں روشن تھیں، اس کے علاوہ چھت سے لٹکے کئی فانوس اور قندیلوں سے وہ سارا ماحول جگمگ کر رہا تھا۔ ہم تین کو اس مرقد میں داخل ہونے دیا گیا۔ میرے علاوہ ایک ہسپانوی جوڑا بھی وہاں اظہار عقیدت کے لیے آیا تھا۔ یہاں ماربل کا ایک ایسا تختہ موجود ہے جس پر صلیب سے اتارے جانے کے بعد حضرت عیسیٰ کو لٹایا گیا تھا۔ عیسائی مورخین کے مطابق مصلوب ہونے کے تیسرے دن جب اس مرقد کو کھولا گیا تو یہ مرکز انوار بنا ہوا تھا۔ اس میں سے خوشبوؤں کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ یہ نور بتدریج ان الفاظ میں بدل گیا کہ ”وہ یہاں نہیں وہ تو بلندیوں کی جانب چلا گیا ہے“ جانے کیوں جب میں نے انگریزی میں یہ الفاظ نادانستہ طور پر دہرائے تو ان کا اس جوڑے پر بہت گہرا اثر ہوا۔ شوہر نے ایک ہاتھ سے بیوی کا اور دوسرے سے میرا ہاتھ تھام لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ مجھے لگا کہ میں تو اپنے عقیدے کی رو سے یہ مصلوب ہونے والی غلطی عام داستان الم اور اس طرح کی دور افتادہ عزاداری سے بالکل ہی لاتعلق ہوں۔ اس کے باوجود میں نے جذبات انسانی کے احترام میں ان کی رفاقت اس وقت تک نبھائی جب تک لائن مارشل نے ہمیں باہر نہ کر دیا اب بیوی نے بھی میرا ہاتھ تھام لیا اور میں بھی ہسپانوی زبان میں بولنے لگا۔ ان کے منہ سے ہسپانوی لفظ Gracia یعنی شکریہ بار بار ٹپک رہا تھا۔ وہ اب ایک دوسرے کا ہاتھ

تھامے آسمان کی جانب کسی ایسی روشنی کو دیکھ رہے تھے جو اس کائنات میں صرف ان کا حصہ تھی۔ اس کلیسہ القائمہ سے نکل کر جب میں باہر شاہراہ پر آیا تو کئی اور یاتری صلیبیں اٹھائے اس طرف آرہے تھے اور میں تھا کہ ایک اور سحر میں مبتلا تھا۔ یہ میرے حضرت عمر بن خطابؓ کی مسجد کا بورڈ تھا جس نے میری توجہ اپنی جانب کھینچ لی تھی۔



کنسیسہ القائمہ کے اندر

یہ اس کلیسہ سے بالکل جڑی ہوئی ہے مگر میں آپ کو بتاتا چلوں کہ فاتح ایران و فلسطین حضرت عمر بن خطابؓ اس دن صلوٰۃ الجمعہ پڑھنے کے لیے جگہ کے انتخاب کا سوچ رہے تھے تو وہاں آئے ہوئے کچھ معززین نے رائے دی کہ مسلمان یہ نماز وقتی طور پر اس کلیسہ القائمہ میں ادا کر لیں۔ اس تجویز کو حضرت عمرؓ نے سختی سے رد کر دیا۔ آپ نے وہاں کے راہب اعلیٰ کو یقین دلایا کہ ان کے اس مقام مقدس کا ہر قیمت پر احترام کیا جائے گا۔ ان کو عبادات کی کھلی آزادی ہوگی۔ اس ملاقات میں خود راہب اعلیٰ نے اس پیشکش کا اعادہ کیا کہ مسلمان صلوٰۃ الجمعہ اگر کلیسہ القائمہ میں ادا کریں تو انہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے اس کی اس دعوت کو سن کر کہا کہ ہر گز نہیں اگر آج انہوں نے اس رعایت کو اپنا لیا تو ان کے بعد اس کو دیگر مسلمان اپنا حق سمجھ کر جتلائیں گے اور یہ کلیسا مسجد میں تبدیل ہو کر رہ جائے گا۔ انہوں نے یہ کہہ کر سامنے میدان میں ایک کنکر پھینکا اور جہاں یہ کنکر جا کر گرا وہاں آپ نے دیگر مسلمانوں کی صلوٰۃ الجمعہ کی امامت فرمائی۔ موجودہ سادہ اور چھوٹی سی مسجد آپ کی حق گوئی اور انصاف و رواداری کے ثبوت کے طور پر اسی مقام پر تعمیر کی گئی ہے۔

\*\*\*\*\*





مغربی کنارے کا شہر الخلیل دو حصوں میں تقسیم ہے

آج ہمارا سفر ہیبرون کی جانب ہے۔ اسے عرب الخلیل کہتے ہیں۔ ہیبرون میں آج کے اسرائیل کا مکمل اور بھرپور نمونہ دیکھا جاسکتا ہے۔ عبرانی زبان میں لفظ ہیبرون کے کئی معنی ہیں، دوستی، ملاپ۔ جس طرح یروشلم کو دارالسلام کہنا باعث تمسخر و تحیر ہے بالکل اسی طرح یہ شہر اپنے معنی سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ دنیا میں یہ شہر سیاسی طور پر آتش بداماں، منقسم اور باہمی مخالفت میں اپنی مثال آپ ہے۔ یہودیوں کے ہاں یروشلم کا درجہ مکہ المکرمہ کی طرح ہے، اسی طرح الخلیل کو مدینہ طیبہ کی مانند سمجھا جاتا ہے۔ فلسطینی عرب البتہ اسے اسلام کا چوتھا اہم شہر مانتے ہیں۔ یعنی مکہ المکرمہ، مدینہ طیبہ اور یروشلم کے بعد اسی کا نمبر آتا ہے کسی اور شہر کا نہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے جب تک اپنا دار الخلافہ یروشلم منتقل نہیں کیا تھا یہ ان کے مملکت کی راجدھانی تھا۔ اس شہر کو سات سو برس تک مسلسل مسلمانوں کے زیر انتظام رہنے کا بھی شرف حاصل رہا، یہاں تک کہ 1967 کی جنگ میں اسرائیل نے اسے اردن سے چھین لیا۔ فلسطین کے مغربی کنارے واقع یہ شہر بہت بڑا ہے اور اس کی صنعتی حیثیت بھی ہے۔ 1994 میں ناروے کے شہر اوسلو میں ہونے والے معاہدے کی رو سے اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک حصے کو H-1 کہتے ہیں جس میں آج کل یہاں تین لاکھ فلسطینی



عرب رہتے ہیں۔ اس کا انتظام فلسطین کی حکومت کے پاس ہے۔ اسے آپ بلاشبہ شہر کا اسی فیصد علاقہ مان سکتے ہیں۔ دوسرا حصہ جسے H-2 پکارتے ہیں اس میں ساڑھے سات سو اسرائیلی اور تیس ہزار فلسطینی عرب آباد ہیں۔ ان ساڑھے سات سو اسرائیلی گھس بیٹھیوں کی اعانت، امداد، حفاظت اور طمانیت قلب کی خاطر بند و قوں سے لیس ڈیڑھ ہزار فوجی ہر وقت تعینات رہتے ہیں۔ یعنی ہر پناہ گیر کی حفاظت پر دو فوجی، گویا یہودی پناہ گیر نہ ہوئے سندھ اور پنجاب کے بڑے رینک والے پولیس افسر ہو گئے۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے جب تک اپنا دار الخلافہ یروشلم منتقل نہیں کیا تھا تو الخلیل ہی ان کے مملکت کی راجدھانی تھا۔ اس شہر کو سات سو برس تک مسلسل مسلمانوں کے زیر انتظام رہنے کا بھی شرف حاصل رہا

سر دست یہ فلسطین کی آزادی تحریک کا مرکز ہے۔ فائرنگ، بم دھماکوں، خنجر گھونپنے کی وارداتیں جو اخبارات کے ذریعے آپ تک پہنچتی ہیں وہ واردتیں اسی شہر سے متعلق ہوتی ہیں۔ اسرائیل نے جن یہودیوں کو یہاں بسایا ہے۔ ان کی اکثریت شدت پسند امریکی اور فرانسیسی یہودیوں کی ہے۔ فرانس میں تخریب کاری اور فسادات کی ایک تحریک برپا دکھائی دیتی ہے، اس کے تانے بانے ماضی میں الجزائر، تیونس، مصر اور تازہ ترین لیبیا میں فرانسیسیوں کے مظالم سے جوڑے جاسکتے ہیں۔ یہ یہودی پناہ گیر سرکاری سرپرستی میں قدیم فلسطینی آبادی پر مظالم ڈھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔



ابراہیم مسجد، الخلیل

ان مظالم کا بھیانک پہلو یہ ہے کہ ایک ہی نوعیت کے جرائم میں ملوث یہودی اور عربوں کے لیے مختلف ضابطے اور سزائیں ہیں۔ عربوں کے جرائم کا فیصلہ برق رفتار اور قہر مزاجی سے فوجی عدالت میں ہوتا ہے اور یہودی مجرم کا ایک تسلی بخش، دھیمے مزاج کی کومل سی مسکراہٹ والی سویلین عدالت میں۔ یہاں رہنے والے ان عربوں کو جن کے پرانے گھراہم شہراؤں پر واقع ہیں حفظ ماتقدم کے طور پر انہیں اپنے گھر کے مرکزی دروازوں سے داخلے کی اجازت نہیں۔ وہ عقبی دروازے، دیواروں سے کود کر یا کھڑکیوں کے راستے سے گھر میں داخل ہوتے ہیں، شرف انسانی کی ایسی توہین دنیا کے کسی شہر اور معاشرے میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔

میرے نزدیک ہسبرون کے الخلیل پکارے جانے کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا شہر ہے۔ اپنی زندگی کا بڑا حصہ انہوں نے اسی شہر میں بسر کیا۔ ان کی پیدائش عراق کی بستی اُر میں ہوئی تھی۔ لیکن ان کا وصال الخلیل میں ہوا۔ اس وجہ سے شہر کو عربوں نے ان کے لقب سے موسوم کر رکھا ہے، اُن کا مدفن مبارک اسی شہر میں ہے۔ ایک روایت کے مطابق اپنی حیات طیبہ میں ہی انہوں نے ایک قطعہ زمین خرید لیا تھا۔ اس جگہ کو انہوں نے اپنے خاندانی قبرستان کا درجہ دے دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسی احاطے میں آپ کو ان کے صاحبزادے حضرت اسحاق اور پوتے حضرت یعقوب کے مبارک مقبرے بھی ملتے ہیں۔ ان انبیائے کرام کی ازواج محترم کی قبور بھی یہیں پر ہیں۔ بادشاہ ہیرڈ نے آج سے دو ہزار سال پہلے ان مزارات کے ارد گرد ایک حفاظتی حصار بنوایا تھا جو آج بھی محفوظ ہے۔ اسی وجہ سے یہ تمام احاطہ اب حرم ابراہیمی اور انگریزی میں Cave of the Patriarchs کہلاتا ہے۔



حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مزار

اس کے علاوہ چونکہ یہاں ہر مقبرے کی ترتیب اس طرح ہے کہ میاں بیوی کے مقبرے ساتھ ساتھ ہیں۔ لہذا اسے عبرانی زبان میں مرأت ہاک فیلہ arat ha-Makhpela'Me بھی کہتے ہیں۔ اس احاطے کے زیر زمین مقبروں میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت سارہ، حضرت اسحاقؑ اور ان کی اہلیہ رقا (Rebecca) اور حضرت یعقوبؑ اور ان کی پہلی بیوی بی بی لیہ ابدی نیند سو رہے ہیں۔ اس پورے احاطے کو ایک بلٹ پروف شیشے سے دو حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی طرف حضرت سارہ، حضرت اسحاقؑ اور ان کی اہلیہ رقا کے مقابر ہیں اور دیگر یعنی حضرت یعقوبؑ، ان کی اہلیہ لیہ اور حضرت یوسف علیہ السلام کے مزارات یہودی احاطے میں ہیں۔ لطف و حیرت کی بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مزار مبارک آپ دونوں طرف سے دیکھ سکتے ہیں۔ شہر میں اکثر سیاح محض اس کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔ اہل یہود تو حضرت آدم علیہ السلام کی زوجہ اور حضرت یوسف علیہ السلام کا مرقد عالیہ بھی اسی مقام کو مانتے ہیں۔



حضرت اسحاقؑ اور ان کی اہلیہ کے مزارات



ہم ہیبرون کے لیے جلد نکل آئے تھے۔ یروشلم سے اس کا فاصلہ حالانکہ کل چالیس کلومیٹر ہے مگر میرا ارادہ اس شہر کو اس کے تمام تر تضادات اور عداوتوں کی روشنی میں دیکھنے کا تھا۔ ہم جب فلسطینیوں والے علاقے جسے H-1 کہتے ہیں داخل ہو رہے تھے تو شہر کسی فتنہ تازہ کے لیے انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا تھا۔ فلسطین شہر کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ اس کا وصف انتشار اور قدامت پسندی ہوتا ہے۔ خواتین وہاں بہت کم بہت دکھائی دیتی ہیں اور وہ بھی بہت لپٹی لپٹائی، کاریں بھی ان سڑکوں پر بہت کم دکھائی دیتی ہیں، زندگی البتہ ان کے گھروں کی بالکونی سے کسی نہ کسی صورت لٹک رہی ہوتی ہے۔ دھلے ہوئے کپڑوں کی صورت میں، کھیلتے ہوئے بچوں کی کلکاریوں میں۔ اس کی خاک آلود شاہراہوں پر جا بجا تعمیراتی سامان بکھرا ہوا تھا۔ ہم شہر کے وسط میں بڑی سی ابو صبیح حلوائی کی دکان کے سامنے رک گئے۔ ان دنوں یہ سارا علاقہ دو قبائل کا مسکن ہے ایک کا نام ہے ابو صبیح تو دوسرا ابوسنانا کہلاتا ہے۔ عبدالقادر کے دام الفت و شناسائی کے جال میں دونوں قبائل بہت موثر انداز میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موصوف خود ابو صبیح سے تعلق رکھتے ہیں تو دامن مناکحت میں ابو سنانا کو لپیٹ رکھا ہے۔ حضرت کی کار کو دیکھتے ہی ہر طرف سے میکے اور سسرال والے دوڑ پڑے۔

چچا، ماموں، کزنز، نسبتی بھائی مر حبا مر حبا کہتے کہتے ہمارے ارد گرد جمع ہو گئے۔ عربوں کے روایتی بوسوں اور گرم جوش معانقوں سے میرا برا حال ہو گیا۔ شہر کی یہ مارکیٹ یوں بھی ایک خاندانی کاروباری مصروفیت ہے۔ اس بازار تعلق داری میں اس نے میرا تعارف یہ کہہ کر کرایا کہ میں اس کا گم شدہ کزن ہوں۔ میرے دادا ابو صبیح قبیلے کے فرد تھے۔ جن کو جنگ عظیم اول میں میرے پردادا عدن لے گئے تھے۔ میرے والد اعلیٰ تعلیم کے لیے وہاں سے انگلستان گئے تھے۔ دوران قیام ایک نیک دل پاکستانی خاتون سے شادی ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے اس تعارف کو جی جان سے قبول کیا کیوں کہ چار جرنیشن پہلے کا کوئی حوالہ وہاں موجود نہ تھا۔ یہ سب کچھ سنتے ہی میرے لیے ابو صبیح حلوائی کے کاریگر میدے کی سویوں، بکری کے پنیر اور شہد سے کنیفہ تیار کرنے میں لگ گئے۔ اسی دوران اس کا کوئی رشتہ دار بھاگ کے اپنے اسٹور سے لبان یعنی چھاچھ Butter Milk لے آیا۔ ایک اور رشتہ دار جسے ایسے معاملات میں پیچھے رہ جانے سے نفرت تھی وہ بھاگ کر اپنی اسٹور سے تازہ تازہ کاک (اب آپ کو سمجھ میں آئے گا کہ معین الدین چشتی کے خلیفہ عظیم بابا فرید الدین گنج شکر کے مرشد محترم خواجہ بختیار کے لفظ میں کاک سے مراد وہ نان ہیں جو انہیں دوران عبادت ایک طاق میں بھوک مٹانے کے لیے مل جاتے ہیں۔ بخارہ کے علاقے اوش میں بھی جہاں سے آپ کا تعلق تھا نان کو کاک کہتے ہیں) اور کھولتی ہوئی کافی کی کیتلی لے آیا۔ میرے اس نودریافت خانوادے کی ہر گز یہ مرضی نہ تھی کہ میں اب عمر بھران کا ساتھ چھوڑ کر کہیں اور جاؤں مگر عبدالقادر نے انہیں سمجھایا کہ میرا ارادہ شہر یعنی H-1 اور H-2 دیکھنے اور حرم ابراہیمی میں صلوٰۃ الجمعہ ادا کرنے کا ہے۔

No H-2 اس کے ایک رشتہ دار نے احتجاجاً اعلان کیا۔ میرے اس استفسار پر کہ وہاں جانے میں کیا قباحت ہے؟ تو وہاں موجود کسی فرد نے کہا کہ وہاں جو یہودی پناہ گیر بسائے گئے ہیں وہ شیطان کے جڑواں بھائی ہیں۔ ان سے قدیم اسرائیلی یہودی بھی نفرت کرتے ہیں۔ یہ بہت شدت پسند اور انسانیت سے عاری گروہ ہیں۔

\*\*\*\*\*

آپ کو یاد ہو گا کہ میں وہاں اٹلی میں عبدالقادر کے رشتہ دار تاجروں سے ایچ ٹو ایریا میں جانے کی ضد کر رہا تھا اور وہ مجھے روک رہے تھے کہ وہ بہت شورش زدہ علاقہ ہے۔ وہاں کے یہودی شیطان کا دوسرا جنم ہیں۔ وہاں جانے کی کوشش میں انہیں قاتل کرنے میں اس لیے کامیاب ہو گیا کہ میں نے انہیں باور کرایا کہ میں وہاں موجود تیس ہزار فلسطینیوں کے حالات کا خود جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ میرا پختہ یقین ہے کہ فلسطینی عربوں میں موجود یہ مسلمان، برما کے روہنگیا، چین کے یو غور مسلمان، سینٹرل افریقن ری پبلک اور شام کے مسلمان اس وقت دنیا کے مظلوم ترین مسلمان ہیں۔ میں ان فلسطینیوں سے ملنا اور گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

ممکن ہو تو میں وہاں موجود یہودی پناہ گروں سے بھی ملنا چاہتا ہوں۔ عین اسی لمحے ایک اور رشتہ دار آگے بڑھا۔ یہ پی ایل او فلسطین لبریشن آرگنائزیشن کا ایک سرگرم کارکن تھا۔ وہ بتانے لگا کہ وہاں کے حالات اتنے کشیدہ ہیں کہ اگر تمہیں کچھ ہو جائے تو اس کی اسرائیل اور دنیا بھر میں کوئی شنوائی نہیں ہوگی۔ یہاں فائرنگ، خنجر زنی اور گرفتاریاں روزمرہ کا معمول ہیں۔ وہاں سیاح جانے سے گریز کرتے ہیں۔ بڑے ٹور آپریٹرز اپنے مہمانوں کو باقاعدہ اطلاع دے کر اسرائیلی فوج کی نگرانی میں لے جاتے ہیں۔ میری درخواست ہے کہ آپ اس غیر ضروری مہم جوئی سے باز رہیں مجھے لگا کہ وہ بہت غیر محسوس طریقے سے میرے لگاؤ کو بھانپ رہے ہیں۔ بہت آہستگی سے یہ ضد جب انہیں بھی مہمان کی ضد سے آگاہی کا سفر نظر آنے لگی اور انہیں بھی یہ محسوس ہونے لگا کہ میں واقعی اپنے فلسطینی بھائیوں کے حالات زندگی اور ان کے کرب کا اندازہ خود وہاں کا مشاہدہ کر کے لینا چاہتا ہوں۔ یہ کھوج لگانا چاہتا ہوں کہ وہ کیا جذبہ اور تحریک ہے جس نے انہیں ان مشکل اور نامساعد حالات میں بھی قیام کرنے پر آمادہ کیا ہوا ہے۔ تذبذب کی اس دھندلی فضا کو عبدالقادر نے اس طرح صاف کر دیا کہ عین اس موقع پر باکسنگ رنگ میں موجود ریفری کی طرح اعلان کیا کہ مصطفیٰ وہاں ضرور جائے گا، وہ باز آنے والا نہیں مجھے وہاں جانے کے لیے ایک ایسا شخص درکار ہے جو اسے یہ سب کچھ دکھا سکے۔ ایک دو فون کال اور میرے لیے وہاں غسان صاحب کا بندوبست ہو گیا۔

ایک چالاک یہودی گائیڈ اب انہیں اس عجائب گھر کے بارے میں بتا رہا تھا۔ میرے لیے اس عجائب گھر میں داخلے کا امکان بہت کم ہے۔ یہاں موجود نوادرات کو اس انداز اور نقطہ نظر سے رکھا گیا ہے کہ یہودیوں کا اسرائیل پر حق ابتدائے آفرینش سے ثابت ہو۔ وہ حضرت مجھے یہودی آبادکاروں کے علاقے H-2 میں مل جائیں گے۔ عبدالقادر کے پاس گوپروانہ راہداری ہے، وہ بھی وہاں کا باشندہ ہے مگر مجھے لگا کہ وہ جانے میں کچھ ہراساں ہے۔ سو، میں نے وہاں موجود اپنے میزبانوں کو اللہ حافظ کہا اور تنہا پیدل ہی چل نکلا۔ مٹی سے اٹی سڑکوں پر چلتے چلتے، کچھ موڑ ادھر ادھر مڑتے میں ایک ایسی دیوار کے سامنے آن پہنچا جس کے پاس جگہ جگہ ریت کے تھیلوں سے بنے ہوئے بنکرز تھے جن کے اندر اور باہر دھوپ کے چشمے لگائے اسرائیلی فوجی تعینات تھے ان کی آرپی جی رائفلوں کو بھی بخوبی دیکھا جاسکتا تھا۔ شہر کو دو حصوں میں بانٹنے کے لیے ایک زنگ آلود turnstile بھی لگا تھا۔ دوسری طرف بھی کئی کمانڈو اور فوجی ہمیں چھتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ان فوجیوں کا تعلق نو بھرتی شدہ فوجیوں میں ہوتا ہے۔ اسرائیل میں ہر نوجوان مرد وزن پر ترکی کی

طرح فوجی تربیت لازم ہے۔ انہیں جس مرحلے سے گزارا جاتا ہے اسے Aliyah (گھر واپسی) کہا جاتا ہے۔ یہ ان کی لازمی ہدایت کا حصہ ہے کہ وہ خطرے کو بھانپتے ہی بند و قوں سے عربوں کو بھون دیں۔



اسرائیل کے یہودی آبادکار ایک فلسطینی خاتون پر حملہ کرتے ہوئے

پاکستان بھی اسرائیل کی طرح ایک نظریاتی مملکت ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ یہاں لازمی فوجی تربیت سے کیوں منہ موڑا ہوا ہے جب کہ یہ قومی تشکیل، میعاریت، نظم و ضبط، دہشت گردی کے خاتمے اور جاسوسی کے اندرونی نظام کے لیے بے حد موثر اور ناگزیر قومی ضرورت ہے۔ چیک پوسٹ پر میں نے اپنا پاسپورٹ ایک مستعد سفتری کے حوالے کیا۔ جس نے میرے سراپے کا جائزہ لیا۔ بیگ کی تلاشی لی اور ایک حفاظتی گیٹ سے گزر کر آگے جانے کی اجازت دے دی۔ یہ پہلا مرحلہ تھا۔ دوسری طرف کی سرحدی باڑ کئی عدد سیمنٹ کے بڑے بلاکس پر مشتمل تھی۔ یہاں سوال جواب کا نیا مرحلہ شروع ہوا کہ میں H-2 علاقے میں کسے جانتا ہوں؟ میرا صحافت سے کیا کوئی تعلق ہے؟ میرے انکار اور سر جن ہونے کی وضاحت پر وہ مطمئن ہو گیا اور مجھے آگے جانے کی اجازت دے دی۔

مجھے لگا کہ میرے قدم مجھے ایک شہر آسیب میں لیے چلے جاتے ہیں۔ یہاں دکانیں بند، ٹریفک نہ ہونے کے برابر۔ غسان سے میری ملاقات شہد اسٹریٹ پر طے تھی۔ میں نے گوگل کے نقشوں کی مدد سے مغرب کی سمت سفر کرنا شروع کر دیا۔ آدھ کلو میٹر چل کر مجھے ایک سیاحتی بس دکھائی دی جو شایید یروشلم سے یہاں آئی تھی اور ایک خالی پلاٹ میں کھڑے ہونے کی کوشش میں تھی۔ بس کے رکتے ہی اس میں دس مشنڈے بندوق بردار اسرائیلی فوجی کودے اور چار اطراف سے بس کو گھیرے میں لے لیا۔ ان کی اجازت سے پھر کوئی پچاس سہمے ہوئے سیاح بس سے اترے۔ میری مسکراہٹ نے ان میں سے ایک بوڑھی عرب عورت کو حوصلہ دیا۔ اُس نے پوچھا ”کیا میں بھی عرب ہوں؟“ ”نہیں میں بھی سیاح ہوں آپ کی طرح۔ ارے تو پھر آپ کا گروپ کہاں ہے؟“ یہ اس کا اگلا سوال تھا۔ میں تنہا ہی گھومتا ہوں۔ آہستہ آہستہ رہائشی علاقے کی جانب بڑھتے ہوئے مجھے اب ایسے یہودی نوجوان لڑکے اور لڑکیاں دکھائی دے رہے تھے جن



کالباس واطوار قدامت پسندانہ تھے۔ یہ مختلف بائیسکلوں پر سوار تھے۔ گلی کے ہر کٹر پر اسرائیلی فوجی کھڑے تھے اور چند خواتین بھی روز مرہ کے سودا سلف کی ٹوکریاں اٹھائے آ جا رہی تھیں۔ ان سے مولیٰ کے پتے باہر جھانک رہے تھے۔ مجھے وہاں بتایا گیا تھا کہ میں اس علاقے میں خواتین کی تصاویر لینے سے گریز کروں گو کہ یہ مناظر یقیناً کیمرے میں محفوظ کر کے آپ کے ساتھ شیئر کرنے والے تھے۔ دس منٹ کی واک کے بعد میں شہداء اسٹریٹ پر پہنچ گیا۔ اس گلی کا ایک اور نام بھی ہے، Apartheid street یعنی شاہراہ نسلی منافرت۔

بہت برس پہلے ایک یہودی جنونی ڈاکٹر Baruch Goldstein حرم ابراہیمی کے احاطے میں داخل ہو گیا تھا اور اندھا دھند فائرنگ کر کے اس نے تیس مسلمانوں کو دوران صلوٰۃ الجمعہ شہید کر دیا تھا۔ اسے مسلمانوں نے وہیں موقع پر دبوچ کر مار دیا جس کی وجہ سے ہنگاموں کا ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔



چھاپے کے بعد ایک فلسطینی کے گھر کا حال

یہ ہنگامے سارے فلسطین میں پھیل گئے جس کے نتیجے میں ناروے کے دار الخلافہ اوسلو میں 1994 میں معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے کی رو سے اب یہ شہر الخلیل دو حصوں میں تقسیم ہے حتیٰ کہ حرم ابراہیمی بھی۔ اس کا ایک حصہ مسلمان اور دوسرا یہودیوں کے لیے مختص ہے۔ مسلمان حصے میں حضرت اسحق علیہ السلام، ان کی اہلیہ ربیکا اور بی بی سارہ کے مقابر ہیں۔ یہودی حصے میں حضرت یوسفؑ، حضرت یعقوبؑ کے مقابر عالیہ ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقبرے کو دونوں حصوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کو ایک عجب انداز سے منقسم کیا گیا ہے کہ بلٹ پروف شیشے سے مزار آدھا دھر تو آدھا یہودی حصے میں آ جاتا ہے۔ 1994 سے پہلے شہداء اسٹریٹ کو یہودی کنگ ڈیوڈ اسٹریٹ کہتے تھے۔ یہاں بڑا کاروباری مرکز تھا، صدیوں پرانا ایک بازار جسے سوق کہتے تھے، اس شہر کی اہم علامت مانا جاتا تھا۔ سوق میں اکثر دکانوں کے مالکان عرب تھے۔ ان کو برباد کرنے اور ان کے لیے عرصہ حیات مزید تنگ کرنے کی خاطر اب ان

یہودی پناہ گیر آبادکاروں کی حفاظت اور سیکورٹی کے نام پر اس شاہراہ اور ان دکانوں کو عربوں کے لیے مستقل طور پر نوگو ایر یا بنادیا گیا ہے۔ عربوں کے وہ گھر جن کا رخ اور صدر دروازے اس مرکزی شاہراہ پر تھے، ان پر اب یہ پابندی ہے کہ وہ اپنے گھروں میں مرکزی دروازے سے داخل نہیں ہو سکتے بلکہ چوروں اور نقب زنوں کی طرح کھڑکیوں اور چور دروازوں سے یا دیواریں پھلانگ کر اندر آ سکتے ہیں۔ پورے بارہ سال تک تو فلسطینیوں پر شہداء اسٹریٹ میں چھوٹے گروپوں کی شکل میں قدم رکھنے پر بھی پابندی تھی۔ معمولی سی خلاف ورزی پر چوکیوں اور واچ ٹاوروں پر ایستادہ یہودی سپاہیوں کی گولی انہیں نشانہ بنالیتی تھی۔ 2007 میں شدید بیرونی دباؤ میں آن کر اب یہ شرط نرم کر دی گئی ہے۔ پیدل ٹولیوں کو وہاں آنے کی اجازت ہے۔ لیکن گولی اب بھی ویسے ہی چلتی ہے۔ کاروں کو البتہ وہاں آنے کی اب بھی ممانعت ہے۔



## ایچ 1 الخلیل

Bait Hadassah Museum کے سامنے سے گزرتے ہوئے میری نگاہ ان ہی سہمے ہوئے سیاحوں پر پڑی جنہیں میں نے بس سے اترتے دیکھا تھا۔ ایک چالاک یہودی گائیڈ اب انہیں اس عجائب گھر کے بارے میں بتا رہا تھا۔ میرے لیے اس عجائب گھر میں داخلے کا امکان بہت کم ہے۔ یہاں موجود نوادرات کو اس انداز اور نقطہ نظر سے رکھا گیا ہے کہ یہودیوں کا اسرائیل پر حق ابتدائے آفرینش سے ثابت ہو، گویا اسرائیل جنت کا حصہ تھا جہاں آدم علیہ السلام رہا کرتے تھے اور انہیں جنت سے بے دخل اس قطعہ مملکت سمیت کیا گیا۔ عربوں کی بند دکانوں پر غلیظ عرب دشمن نعرے لکھے ہوئے تھے۔ ایک جگہ بڑے الفاظ میں Free Israel کا نعرہ بھی درج تھا۔ یہ اسرائیل میں انتہائی دائیں بازو کی شدت پسند صیہونیت سوچ کا نعرہ ہے۔ ہیبرون کے اکثر یہودی پناہ گیر آبادکار اس سوچ کے حامی ہیں۔ سڑک کے خاتمے پر ایک سیمنٹ بلاک کی اوٹ مجھے ایک گول متھلوسا نوجوان نظر آیا یہ غسان تھا۔ مجھے اسے پہچاننے میں اس لیے دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیونکہ مجھے اس کی تصویر دکھادی گئی تھی۔

\*\*\*\*\*





اپنے گھر میں آمد

شہداء اسٹریٹ کے اختتام پر ایک سینٹ بلاک کی اوٹ میں مجھے گول متھلو سا غسان دکھائی دے گیا۔ چلتے وقت الخلیل کے ایچ ون علاقے میں اس کا تعارف مجھے بہت تفصیل سے کرا دیا گیا تھا۔ غسان میاں چالاک تھے۔ ایسے چالاک جو ذہانت بہت سینٹ سینٹ کر رکھتے ہیں۔ مجھے بھی انہوں نے دور سے پہچان کر بہت سرعت سے پتلی گلی پکڑی۔ یہ ایک واضح اشارہ تھا کہ ع

ملنا جلنا جہاں ضروری ہو

ملنے جلنے کا حوصلہ رکھنا

میں بھی بہت آرام سے ٹہلتا ہوا اُس گلی میں چلا گیا۔ وہ لا تعلقی سے تیز تیز آگے بڑھتے ہوئے ایک ایسی جگہ آگئے جہاں کسی چھاپے کی صورت میں فرار کے بہت سے راستے تھے۔ میرے نزدیک آنے پر ایسے لپٹ گئے جیسے جنم جنم کی ملاقات ہو۔ چند سو میٹر کی یہ پھرتی اس کی سانسوں کو بھاری پڑی تھی۔ وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا، شاید خوف بھی تھا۔ گلے ملنے اور سانسوں کے بحال ہونے تک حضرت نے ملاقات کی اس بے ضابطگی کا احوال اس وضاحت سے دیا کہ وہاں ملتے تو اسرائیلی فوجی اسے گرفتار کر لیتے اور مجھے شامل تفتیش کر کے ہر اسماں کرتے۔ چند گلیاں چھوڑ کر جب ان کا محلہ اور گھر آگیا تو مجھے لگا کہ یہ تو وہی شہداء اسٹریٹ کا پچھواڑہ ہے۔ یہ درست تھا کیوں کہ اس کا مرکزی دروازہ بھی دیگر گھروں کی مانند ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سیل کر دیا گیا۔ داخلے کی اجازت عقبی دروازے سے تھی۔ اس میں کسی قسم کوئی رورعایت نہ تھی۔



اسی دوران میں مجھے پانچ اسرائیلی فوجیوں نے گھیر لیا۔ ان کی بندوق کی نالیوں کا رخ میرے سر اور سینے پر تھا۔ وہ عبرانی زبان میں چیخ رہے تھے۔ ان کی گرفت سے مجھے لگ رہا تھا کہ مجھے ان رسوائے زمانہ فوجیوں نے حراست میں لے لیا ہے۔ میں نے اطمینان اور سکون سے ہاتھ اوپر کر لیے اور انہیں آہستگی سے بتلایا کہ میں تو سیاح ہوں۔

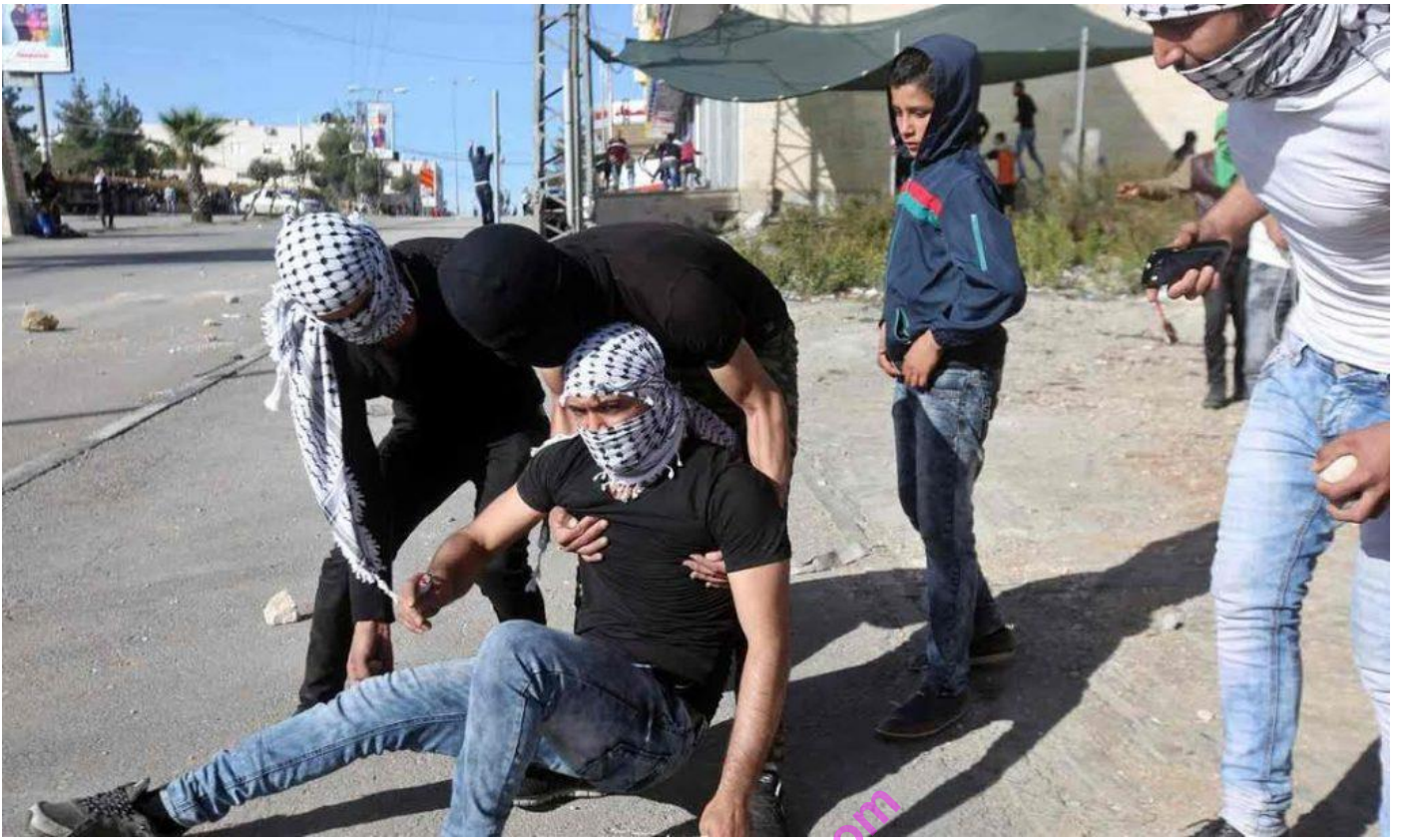
وہ مجھے لے کر چھت پر چلا گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ نارمل زندگی کسے کہتے ہیں، اس کا ہمیں تو اب ادراک اور ذائقہ بھی نہیں رہا۔ ہمارا ہر گھر بیت الائم ہے۔ ماتم کدہ رفتگاں و شہیدان وطن ہے۔ شاید ہی کوئی فلسطینی گھرا یا ہو جس کی میز پر کسی شہید کی تصویر نہ ہو۔ کوئی ماں بہن بیٹی ایسی نہیں جس کی آنکھ اپنے بیٹے بھائی یا باپ لیے اشکبار نہ ہو۔ ہم ایسے مجبور ہیں جو شہادت کے منتظر ہیں۔ اس چھت سے بائیں جانب وہ جو گھر ہے وہ ام حبیبہ کا ہے۔ ان یہودی پناہ گیر آبادکاروں نے اس کے میاں اور دو نوجوان بیٹوں کو مار ڈالا۔ یہ قاسم کا گھر ہے۔ اس نے ایسے ہی کسی گھر کی جانب اشارہ کیا، قاسم نابینا اور جھلسا ہوا ہے۔ اس کے چہرے پر کسی یہودی نے تیزاب پھینک دیا تھا۔ میں گھر کی جانب کیا دیکھتا۔ میری آنکھیں دھندلا چکی تھیں۔ کانوں میں سنائے گونج رہے تھے اور ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ میں خود کو کوس رہا تھا کہ اس بستی کرب و بلا میں آنے کا فیصلہ میں نے آخر کیوں کیا۔ ساری دنیا انہیں نظر انداز کیے بیٹھی ہے۔ انہیں مرنے دو۔ میں بھی ایسا کر لیتا۔

کسی دن ان کا تہوار ہوتا ہے تو یہ بہانے سے ہماری بستی میں آ جاتے ہیں، اس قدر بے ہودگی اور ظلم کرتے ہیں کہ اللہ کی پناہ۔ ہم اقوام متحدہ کے فوجیوں کو درخواست کرتے ہیں کہ ایسے موقع پر وہ آ جایا کریں۔ ہمارے بچے بھی اب انہیں مبصرین کی نگرانی میں اسکول جاسکتے ہیں، تنہا نہیں۔

”تمہارے بچے ہیں ڈاکٹر صاحب“ مجھے لگا کہ وہ یہ سوال شاید مجھے ڈی اسٹریس کرنے کے لیے پوچھ رہا ہے۔ میں نے بھی اپنی نارمل حالات میں لوٹنا مناسب سمجھا ”جی۔ دو“

”آپ یقیناً اُن سے پیار بھی بہت کرتے ہوں گے“۔ غسان نے اپنا بیان جاری رکھا۔ مجھے لگا کہ میں تو اسی خارزار میں بھٹک رہا ہوں

جی ہاں دنیا میں وہی میرے لیے سب کچھ ہیں۔ میں نے بھی زندگی کی اس بڑی حقیقت کا اظہار ایک ایسی کیفیت میں کیا جس کی بے یقینی سے ان لمحات کی تلخی کے حوالے سے صرف میں ہی واقف ہوں۔



جدوجہد آزادی

اُن کی آواز اب ڈوب چلی تھی۔ ایسا لہجہ ہو چلا تھا جو یا تو بہت پیار میں ڈوبی گھڑیوں کا ہوتا ہے یا ان کڑواہٹوں کو جو آپ کی صوتی رگوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ وہ کہہ رہا تھا ان سے پیار کر نامت چھوڑیے گا۔ ہمارے بچوں کی زندگی کی سب بڑی خوشی یہ ہوتی ہے کہ وہ اس شہدائے اسٹریٹ پر کھیلے کو دیں دوڑیں بھاگیں۔ وہ ہماری لاکھ احتیاط اور ممانعت کے باوجود ایسا کرتے بھی ہیں۔ انہیں موت کی مستقل مزاجی کا علم نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ موت REVERSIBLE PHENOMENON ہے۔ سارا دکھ تو زندہ رہ جانے والوں کے لیے ہوتا ہے۔ وہ اس کو آزادی اور بغاوت سمجھ کر نکل جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک موت کا ہاتھ تھا مگر اس سڑک پر نکلنا ہی زندگی ہے۔ یہی آزادی ہے، بے حیثیت ہی سہی مگر اختیار تو اپنا ہے۔

میں نے گفتگو کا یہ الم انگیز بیانیہ حل اور تجزیے کی جانب موڑ دیا۔ آپ تو بہت عمدہ موٹر مینک ہیں۔ یہ جگہ چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ ایچ ون یا کہیں اور کیوں نہیں چلے جاتے۔ ہمارے دشمن، یہ گھس بیٹھے بھی یہی چاہتے ہیں کہ ہم ان کی ان حرکات سے زچ ہو کر علاقہ چھوڑ دیں۔ ہم ایسا ہرگز نہیں کریں گے۔ ہمارا یقین ہے کہ ہم نہ سہی ہمارے دوسری تیسری چوتھی نسل اس سرزمین پر ایک دفعہ پھر آزادی کا سانس لے گی۔ اب اس کی آواز میں توانائی اور اعتماد تھا۔ ہر ظلم کو ایک دن مٹ جانا ہے۔ ہر ظالم کو برباد ہو جانا ہے۔

ہم وہاں سے نکل کر ایک گھنٹے تک عرب علاقوں میں گھومتے رہے۔ یہاں ہر جانب غربت عیاں تھی۔ ان کے غریبوں میں اور ہمارے غریبوں میں دو بڑے واضح فرق ہیں۔ اجتماعی شعور، اور بے پناہ صفائی، ان کی خواتین، ان کے لباس سے غربت اور لمحات اندوہ کرب میں بھی پاکیزگی اور رکھ رکھاؤ دکھائی دیتا ہے۔ وہاں جن سے بھی بات ہوئی ہر گھر سے وابستہ ایک داستان الم کے پیچھے اعتماد اور امید تھی۔ یہ

بڑے غازی اور مجاہد لوگ ہیں، میں جب ایچ ون کی طرف واپس آ رہا تھا تو اندر سے بہت کڑی کڑی ہو چکا تھا۔ بہت سے سوال تھے جن کا میرے پاس اپنی زندگی کے حوالے سے اور ان کی زندگی کے حوالے سے کوئی جواب نہ تھا۔ آپ ٹی وی پر جو مناظر دیکھتے ہیں ان کے ساتھ گھر کا ایک احساس تحفظ وابستہ ہوتا ہے، ان جگہوں کو جب حقیقت میں وہاں جا کر دیکھتے ہیں تو آپ پر سچ کا بوجھ سنگِ گراں کی مانند آن پڑتا ہے۔

غسان کہہ رہا تھا اپنے بچوں سے پیار کرنا مت چھوڑیے گا۔ ہمارے بچوں کی زندگی کی سب بڑی خوشی یہ ہوتی ہے کہ وہ اس شہدِ اسٹریٹ پر کھیلیں کو دیں دوڑیں بھاگیں۔ وہ ہماری لاکھ احتیاط اور ممانعت کے باوجود ایسا کرتے بھی ہیں۔ انہیں موت کی مستقل مزاجی کا علم نہیں۔

ایچ ون کے علاقے میں میری واپسی تک دوپہر ہو چکی تھی اور عبدالقادر میرا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے یہ نہ پوچھا کہ وہاں میں نے کیا دیکھا یا میرے ساتھ کیا کچھ ہوا۔ ایسا لگتا تھا میرا احوال میرے چہرے پر درج تھا جو اس نے بہت خاموشی سے پڑھ لیا ہے۔ میں نے صلوٰۃ الجمعہ کا قصد کیا۔ اس مقصد کے لیے ہم آہستہ آہستہ حرمِ ابراہیمی کی جانب بڑھنے لگے۔ اسے یہودی Cave of Patriarchs، یعنی غارِ بزرگاں بھی کہتے ہیں۔ راستے میں تین ملٹری چیک پوسٹ آئیں۔ تیسری چیک پوسٹ سے گزر کر ہم ایک پختہ احاطے میں داخل ہو گئے۔ اس احاطے میں بائیں جانب نصب turnstiles سے گزر کر فلسطینی داخل ہو سکتے ہیں۔ انہیں یہاں سنگل قطار میں کھڑا ہونا ہوتا ہے۔ ہر فرد واحد کو اسرائیلی فوجی اچھی طرح سے کھنگالتے ہیں۔ مکمل جامہ تلاشی کے بعد انہیں مسجد میں داخل ہونے دیا جاتا ہے۔ قادر کو چونکہ وضو کرنے کے لیے جانا تھا۔ لہذا وہ مجھے اس ہدایت کے ساتھ کہ میں اس کے واپس آنے تک اسی جگہ اس کا انتظار کروں، چھوڑ کر چلا گیا۔ مجھے خیال آیا کہ یوں ہی بے کار اس کی راہ تکتے سے تو بہتر ہے کہ میں ایک آدھ تصویر اس مقام کی کھینچ لوں۔ میں نے قطارِ مجبوری میں کھڑے عربوں اور اس چیک پوسٹ کی تصویر کھینچ لی۔ جیسے ہی میرا ارادہ دوسری تصویر کھینچنے کا تھا مجھے چار سوا ایک یلغار سنائی دی۔ اسی دوران میں مجھے پانچ اسرائیلی فوجیوں نے گھیر لیا۔ ان کی بندوق کی نالیوں کا رخ میرے سر اور سینے پر تھا۔ وہ عبرانی زبان میں چیخ رہے تھے۔ ان کی گرفت سے مجھے لگ رہا تھا کہ مجھے ان رسوائے زمانہ فوجیوں نے حراست میں لے لیا ہے۔ میں نے اطمینان اور سکون سے ہاتھ اوپر کر لیے اور انہیں آہستگی سے بتلایا کہ میں تو سیاح ہوں۔ میرا پاسپورٹ بھی میرے داہنے ہاتھ میں تھا۔ ایک فوجی نے میرا پاسپورٹ جھٹ سے چھین کر اس کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس دوران اس کی نگاہیں گاہے بہ گاہے پاسپورٹ سے اٹھ کر میرے چہرے پر مرکوز ہو جاتیں۔ یہاں کیسے آئے؟ اس نے قدرے درشتگی سے پوچھا۔ ”بذریعہ ٹیکسی“ میں نے جواباً وضاحت کی۔ ڈرائیور کہاں ہے؟ اس نے اگلا سوال داغا مگر اس کا لہجہ اب قدرے نرم تھا۔ میری نگاہ سامنے سے آتے ہوئے عبدالقادر پر پڑی تو یک گونہ اطمینان سا ہوا، مجھے یقین تھا کہ مقامی باشندہ ہونے اور اس طرح کے حالات کا مسلسل سامنا کرنے سے وہ بخوبی واقف ہو گا۔ جیسے ہی انہوں نے قادر کو دیکھا وہ اس پر بے رحمی سے ٹوٹ پڑے اور اس کے ہاتھ اور گریبان قابو کر کے اس کا سر ایک دیوار سے لگا دیا۔ یہ



میرے لیے ناقابل برداشت تھا کہ ایک بوڑھا ڈرائیور میری وجہ سے اس عتاب بے جا کا نشانہ بنے۔ میرا خون کھول گیا۔ میں ان کے اور عبدالقادر کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ جس پر عبدالقادر نے چیخ کر مجھے ایک جانب ہٹ جانے کو کہا وہ کہہ رہا تھا، Doc go away, stay away, I will handle it۔ میں نے بھی انہیں تقریباً چیخ کر یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر یہ کوئی جرم ہے تو میرا ہے وہ بے چارہ تو وہاں موجود بھی نہ تھا۔ جو معاملہ ہے مجھ سے کریں۔

عبدالقادر بے چارہ مریض قلب ہونے کی وجہ سے بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ لائن میں کھڑے دیگر نمازیوں میں جو یہ سارا واقعہ دیکھ رہے تھے ایک بے چینی اور اضطراب کی لہر دوڑ گئی وہاں سے صدائے احتجاج بلند ہونے لگی اور ایک ہنگامہ پھوٹ پڑنے کا امکان پیدا ہو گیا۔ میری نگاہ اس دوران اقوام متحدہ کے دو مبصرین پر پڑی جو غارِ بزرگاں Cave of Patriarchs کی ڈھلوان پر کچھ فاصلے پر کھڑے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ میں نے جست بھری اور ان کے پاس جا پہنچا۔ ان دو مبصرین میں ایک تو ڈنمارک کی خاتون تھی اور دوسرے صاحب کا تعلق جنوبی افریقا کے شہر کیپ ٹاؤن سے تھا۔ میں نے انہیں جلدی جلدی اپنی پتا سنائی۔ یہ سنتے ہی وہ دونوں مجھے ساتھ لے کر تقریباً بھاگتے ہوئے ان اسرائیلی فوجیوں کی جانب جارحانہ انداز میں بڑھے۔ موقع کی نزاکت بھانپ کر اسرائیلی فوجی ایک دم پیچھے ہٹ گئے۔ ایک نے ذرا فاصلے سے انہیں بتایا کہ میں ممنوع علاقے میں تصاویر لے رہا تھا۔ میں چونکہ ایک سیاح ہوں لہذا یہ ڈرائیور کی ذمہ داری ہے کہ مجھے وہ ان تمام مضمرات سے پہلے ہی آگاہ کرتا۔ میں نے انہیں بتایا کہ قادر تو وضو کرنے گیا تھا اور ایک تاریخی اور سیاسی اہمیت کی جگہ ہونے کے ناطے تصاویر لینے کا فیصلہ خالصتاً میرا محرکاتی عمل تھا۔ میرا ہم وطن جو واضح طور پر میرے لیے ہمدردی کے جذبات رکھتا تھا اس نے تجویز پیش کی کہ فوجی میرا آئی فون دیکھ لیں اور وہ دو تصاویر جو میں نے اس احاطے میں کھینچی ہیں۔ انہیں ڈیلیٹ کر دیں۔ انہیں بھی یہ تجویز بھلی لگی۔ اس پر فی الفور عمل بھی ہو گیا اور انہوں نے ہم دونوں کو مسجد میں صلوٰۃ الجمعہ کے لیے جانے دیا۔

مسجد کی راہداری تک پہنچتے پہنچتے قادر کے اوسان بحال ہوئے تو اس نے مجھے کہا کہ میں تو ایک مجاہد ہوں۔ میں نے اسے کہا کہ میرا تعلق پاکستان کے علاقے پوٹھوہار سے ہے۔ ہمیں ویسے بھی غیر ضروری جنگوں کی بہت عادت ہے۔ ہٹلر نے جب ہمارے سپاہیوں کو اتحادیوں کے لیے جان لٹاتے دیکھا تو اس نے جبریل رومیل کو کہا کہ اگر مجھے انگلش ٹینک اور پوٹھوہاری سپاہی مل جائیں تو دنیا فتح کرنا اتنا مشکل کام نہیں۔

مجھے لگا عبدالقادر کو ہٹلر کی حکمت عملی پسند آئی اور ہم مسکراتے ہوئے حرم ابراہیمی میں واقع صلوٰۃ ہال میں داخل ہو گئے۔

\*\*\*\*\*

مجھے احساس ہوا کہ اسرائیلیوں سے پاکستان کی پہلی جنگ میں جو عبدالقادر فلسطینی کو چھڑانے کے لیے ہوئی تھی اس میں میرے منہ پر ایک عدد زوردار مکالگ گیا تھا جس کی وجہ سے مسوڑھوں سے ذرا خون آ رہا تھا سو میں نے دوبارہ وضو کرنا ہی بہتر سمجھا۔ ویسے تو حنفی فقہ میں شہید کو غسل معاف ہے، میں وضو کر کے ایک مقدس مقبرے میں چلا گیا۔ یہاں 1994 سے اب ایک تقسیم کر دی گئی ہے۔ مسلمانوں کی طرف مسجد ابراہیمی ہے اور اہل یہود نے اپنا ایک Synagogue بنالیا ہے۔ موجودہ احاطہ بادشاہ ہیروڈ نے ان غاروں کے اوپر بنایا تھا جن کے بارے میں مشہور ہے کہ یہاں انبیائے علیہا السلام اور ان کی ازواج مدفون ہیں۔ ان تک رسائی ناممکن بھی اور ممنوع بھی ہے۔ ایک طویل عرصے سے کھوجی، نوادرات اور مذہبی جنونی ہمہ وقت اس جستجو میں رہتے ہیں کہ کسی طرح ان غاروں تک چاہنچیں۔ ان کی دخل اندازی کو روکنے کی خاطر اب علامتی طور پر دو عدد سوراخ اس طرح چھوڑ دیے گئے ہیں کہ ایک ٹرے کے ذریعے ان سے زیر زمین مقابر پر پھول نچھاور کیے جاسکیں، تصویر میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ بمشکل 28 سینٹی میٹر کی گول رسائی ہے۔ ایک سوراخ مسجد میں سے دوسرے یہودی معبد میں موجود ہے۔



ایک روایت کے مطابق یہاں حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کی قبور مبارکہ بھی ان ہی زیر زمین غاروں میں موجود ہیں۔ ان تک رسائی ناممکن ہے۔ ان تک رسائی کا راستہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے فتح یروشلم کے موقع پر پتھروں سے سیل کر دیا تھا۔ ہر نبی محترم کی قبر کے پہلو میں ان کی زوجہ محترمہ کی قبر بھی ہے۔ مسجد میں داخل ہوتے ہی احاطہ صلوٰۃ میں آپ کی نگاہ ان تعویذات (وہ مقابر جو اصل قبر کے اوپر تعمیر کیے جاتے ہیں) پر پڑتی ہے۔ یہ تعویذ حضرت اسحاقؑ اور ان کی اہلیہ بی بی ربیکا کے ہیں۔ مسجد کے مین ہال

میں داخل ہونے سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کی زوجہ محترمہ بی بی سارہ کی قبر آتی ہے۔ آپ حضرت اسحاقؑ کی والدہ محترمہ تھیں۔ مویشے دیان جو 1967 کی جنگ میں اسرائیل کے وزیر دفاع تھے وہ خیر سے ایک شوقیہ ماہر آثار قدیمہ بھی تھے۔ انہیں اس مقام کے بارے میں جان کاری کا بہت ہو کا تھا سو انہوں نے بارہ برس کی ایک نازک بدن لڑکی Michal کو ایک پیمائشی فیتہ، سر پر ایک کھوجی بتی اور نوٹ بک کے ساتھ اس شہتیر والے سوراخ سے غار مزار کے اندر اتارا تھا۔ اس موقع پر سرکار کے اہم افسران، اسرائیل کے بڑے یہودی ربائی اور وہ خود بھی موجود تھے۔ خود اسرائیلی فوج میں باقاعدہ طور پر ایک میجر جنرل شولوم گورین کو ربائی کو چیف ربائی کا عہدہ ملا ہوا تھا۔ وہی سب سے پہلے یہاں جھنڈا لہرانے پہنچا تھا۔



1967

سے سات سو سال پہلے تک یہودی صرف ساتویں سیڑھی تک جاسکتے تھے۔ یہ مملوک بادشاہوں کا حکم تھا جس پر اتنے عرصہ تک عمل ہوتا رہا۔ لڑکی پر تاحال انٹرویو دینے کی پابندی ہے۔ اس کے گھروالوں کا بیان ہے کہ اس لڑکی کی نفسیاتی کیفیت اس واقعے کے بعد پہلے جیسی نہ رہی۔

میں اس وقت سر جھکائے حضرت ابراہیمؑ کے مزار عالیہ پر کھڑا تھا دوسری جانب یعنی بلٹ پروف گلاس کے اس طرف مغربی سیاح اور یہودی عبادت گزار موجود تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام دنیا کے تینوں بڑے مذاہب یعنی یہودی، عیسائیت اور اسلام میں بڑی جلیل القدر ہستی سمجھے جاتے ہیں۔



موزن حسن نے مجھے یہ کہانی سنائی، اُن کا خیال تھا کہ جن جگہوں کی حفاظت اللہ کرتا ہے وہاں انسانی مداخلت محض رسوائی، ذلت اور پریشانی کا سبب بنتی ہے۔ میں اس وقت سر جھکائے حضرت ابراہیمؑ کے مزار عالیہ پر کھڑا تھا دوسری جانب یعنی بلٹ پروف گلاس کے اس طرف مغربی سیاح اور یہودی عبادت گزار موجود تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام دنیا کے تینوں بڑے مذاہب یعنی یہودی، عیسائی اور اسلام میں بڑی جلیل القدر ہستی سمجھے جاتے ہیں۔ مجھے میری دوست اور موجودہ میزبان ڈاکٹر کلورلی یاد آئی جو مجھے اکثر کہا کرتی تھی۔ تم اس قبر عالیہ پر دیکھنا جو ہمارے جد امجد حضرت ابراہیمؑ کی ہے ان کے دو بیٹے، دو بھائی تھے، اسحاق اور اسمعیل۔ اب وہاں ایک شیشے کی دیوار ہے جس کے آر پار ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں سن اور سمجھ نہیں سکتے۔ سمجھے! جب تک میں یہ سمجھنا چاہتا صلوٰۃ الجمعہ کی ساعت آگئی تھی۔

حرم ابراہیمی میں صلوٰۃ الجمعہ میرے لیے اور اک اور شعور سے پرے، بہت انوکھا سا تجربہ تھا۔ صف بندی کی وجہ سے میرا سیدھا کندھا حضرت اسحاقؑ کے مزار عالیہ کے تعویذ کو چھو رہا تھا۔ صف بندی کے دوران میں نے جب نمازیوں کی تعداد گنی تو وہ بمشکل پچاس تھی۔ میرا موجودہ وطن جنوبی افریقا گو کہ مسلمان ملک نہیں اور یہاں مسلمانوں کی تعداد دو فیصد سے بھی کم ہے مگر آپ کو یہ جان کر حیرت ہو کہ وہاں گجراتی اور ملائی مسلمان جنہیں گورے بطور غلام لائے تھے، ایسے مسلمان ہیں کہ وہاں بعض محلوں میں تہجد کی نماز بھی لوگ مسجد میں اسی کثرت سے پڑھنے آتے ہیں اور فرض نمازوں میں جماعت کی خاطر خواتین کی بھی کثیر تعداد محلوں کی مساجد میں آتی ہے۔ صلوٰۃ الجمعہ میں تو دور دراز کے گاؤں کی مساجد میں بھی تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی۔ یہاں معاملہ بہت کرب کا تھا۔ اسلام کا چوتھا اہم مقدس شہر اور نمازیوں کی تعداد بمشکل تین درجن کے قریب۔ ایسا نہیں کہ یہاں کہ لوگ جذبہ ایمان سے محروم ہیں مگر پناہ گروں اور اسرائیلی افواج کے جبر مسلسل کے ہاتھوں اور دنیا بھر کے مسلمانوں کی بے حسی کی باعث اب وہ کچھ نڈھال سے ہو چلے ہیں۔ ایسے اجتماعات عام طور پر فسادات کا بہانا بن جاتے ہیں۔ اسرائیلی گولیاں مارنے میں اور نوجوانوں کو قید میں اذیت دینے سے باز نہیں آتے۔ تحلیل کے ایسے کئی سو نوجوان قید ہیں جن کی عمر بیس سال بھی کم ہے۔

صلوٰۃ سے فارغ ہو کر باہر نکلے تو عبدالقادر اور میں ابو صبیح حلوائی کی دکان کی طرف چل پڑے جہاں کار کھڑی تھی۔ یہ فاصلہ ذرا طویل تھا مگر مجھے یہ چہل قدمی یوں بھلی لگی کہ مجھے اس بہانے شہر کو دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ ہم ایک تنگ سی مارکیٹ میں داخل ہو گئے۔ یہاں کاروبار چل رہا تھا۔ ہسپرون والے فلسطین بھر میں اپنی کاروباری مہارت کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ جب ان کا کاروبار کنگ ڈیوڈ اسٹریٹ یعنی شہدائے اسٹریٹ سے بزور جبر واستبداد لپیٹ دیا گیا تو وہ یہاں سوق میں اٹھ آئے۔ یہاں ایک جگہ انار کا جو س نکالا جا رہا تھا۔ ویسے تو ہسپرون کے سبھی پھل بہت ذائقہ دار ہیں مگر ان کے انار اور انگوروں کا کیا کہنا۔ سرخ میٹھے اور پھولوں کی خوشبو کو مات کرتے تازہ انار کا جو س دیکھ کر میری طبیعت مچل گئی۔



بازار اور گھروں پر یہودی جو کچرا پھینکتے ہیں، وہ دیکھا جاسکتا ہے

ہم جو س پی کر آگے بڑھے تو اچانک میرے سیدھے کاندھے پر کوئی شے آکر گری۔ کسی حرامزادی نے مجھ پر اپنے بچے کا غلیظ پوتڑہ پھینک دیا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ اوپر جا کر ایک چائٹا سے رسید کروں مگر قادر نے میرے ارادے کو بھانپ لیا اور مجھے کھینچ کر ایک طرف لے گیا۔ ”ایسے موقع پر الحمد للہ کہتے ہیں۔“ اس نے مجھے نئی سناونی دی۔ ”کیا کوئی مجھ پر گندگی اُچھالے اور میں اس کو سبق سکھانے کی بجائے ایک بزدل کی طرح اللہ کا شکر ادا کرنے میں لگ جاؤں۔“ میں غصے سے کھول رہا تھا۔ اس نے مجھے اوپر دیکھنے کو کہا سارے بازار پر ایک جالی لگی تھی۔ اس جالی کے اوپر بازار کے دونوں طرف رہائشی عمارتوں کی تنگ کھڑکیاں قطار در قطار چلی گئی تھیں۔ ان کھڑکیوں سے ہر طرح کا کچرا پھینکنے کی علامات اس جالی کے اوپر موجود تھیں، پرانے جوتے، گندے کپڑے، پتھر، تھیلیاں جو ان عمارات کے مکینوں کے ذوق سلیم اور سماجی شعور کی نشانی تھیں۔





یہودی جوز بردستی مسجد میں داخل ہو گئے

ان عمارتوں میں دنیا کے سب سے کمینے اور بے رحم یہودی پناہ گیر رہتے ہیں۔ جب لوگ مسجد ابراہیمی سے نماز پڑھ کر آتے ہیں تو ان پر غلاظت باری بڑھ جاتی ہے۔ شراب کی بوتلیں تک پھینکی جاتی ہیں، ہم اسے مکہ المکرمہ میں ہمارے نبی ﷺ کے ابتدائی ایام میں کفار مکہ کے ہاتھوں پہنچائی گئی اذیت پر آپ کی برداشت سمجھ کر اس طوفان گندگی پر اللہ کا شکر ادا کرنا سنت نبوی مانتے ہیں۔ اسٹیل کی جالی کی یہ چھت بے چارے دکانداروں نے تانی ہے تاکہ گندگی کے ان میزائلوں سے بچت ہو جائے۔ مجھے یہ بات سن کر ایسی طمانیت ہوئی کہ میں نے اسی وقت درود شریف پڑھ کر شکر الحمد للہ کہا۔ ذرا آگے بڑھے تو ایک بہت بڑا کچن نظر آیا جہاں لوگ برتن تھامے قطار میں کھڑے تھے۔ یہ سوپ ابراہیمی ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ سلام کو غریبوں کو کھانا کھلانا بہت اچھا لگتا تھا۔ یہ ان کی سنت ہے۔ ہر دن مختلف قسم کا سوپ یہاں سے تقسیم ہوتا ہے۔ پیر کو مرغی اور جمعہ کو گوشت، باقی دنوں میں سبزی کا سوپ۔ پچاس ہزار سے ساٹھ ہزار لوگ جو بے حد غریب اور ضرورت مند ہیں ان کا اس اسکیم سے پیٹ بھر جاتا ہے۔ اس پریشان حال بستی میں جہاں غربت ہر طرف عیاں ہے، لوگوں کا تین ہزار سال پرانی سنت کو اس لیے زندہ رکھنا کہ اس سے کمزور اور معاشی طور پر مفلوک الحال افراد کا پیٹ بھر جائے، منتظمین کے حق میں بے شمار دعاؤں کا حق دار ہے۔ یہ نہ بھولیں کہ دنیا میں ہندوستانی، روڈینگیا، چینی یو غور، شامی، وسطی افریقا اور فلسطینیوں سے زیادہ مظلوم کوئی اور مسلمان اقلیت نہیں۔

”ہم آگے بڑھتے رہے۔ کہیں فلسطین کی آزادی کے نعرے تھے تو کہیں الخلیل شہر آسیب کے۔ ہم چلنے لگے تو وہاں پر موجود دونوں قبائل ابو صبیح اور ابوسنانا والے بضد تھے کہ بغیر لپنج کے نہ جائیں۔ سفر لمبا تھا اور ہماری منزل ذرا دور، سو ہم بمشکل اس وعدے پر کہ اگلی بار موقع ملا تو ایک ایک دن دونوں کا مہمان رہیں گے، ان سے گلو خلاصی مل سکی۔



شاہ بلوط کے درخت کو Ibrahim ”s Oak“ یا بلوط ابراہیمی بھی کہتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اسی کی چھاؤں میں ایک خیمہ میں اپنی عمر کا بڑا حصہ گزارا۔ یہیں آپ کو یہ بشارتیں ہوئیں کہ آپ کے دو عدد صاحبزادوں اور ایک کزن حضرت لوطؑ کو نبوت سے سرفراز کیا جائے گا۔

سڑک پر آن کر اچانک عبدالقادر کو یاد آیا کہ الخلیل چھوڑنے سے پہلے وہ مجھے کسی سے ملوائے۔ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے تیزی سے بائیں جانب گاڑی موڑ لی۔ ڈیرھ میل کی مسافت کے بعد ہم ایک ایسی خانقاہ کے پاس پہنچے جو بند تھی۔ اس کے کھلنے کے اوقات صبح نو بجے سے بارہ بجے واضح طور پر درج تھے مگر عبدالقادر کہاں باز آنے والا تھا۔ وہاں موجود نوجوان گارڈ کے باپ کا رشتہ اللہ جانے کہاں سے ڈھونڈ نکالا۔ اُسے بتایا کہ وہ تو پیدا بھی نہیں ہوا تھا جب اس کا باپ اور وہ سامنے والے باغ سے انگور چُرا چُرا کر کھاتے تھے۔ ایسا پرانا اور گھناؤنا تعلق۔ گارڈ نے خاندانی کمزوری کو مزید تشہیر سے بچانے کی خاطر خانقاہ کے دروازے پھٹ سے کھول دیے۔ دروازہ کھلتے ہی ایک پلیٹ فارم پر نگاہ پڑی جس کے وسط میں شاہ بلوط کا درخت تھا اسے Ibrahim ”s Oak“ یا بلوط ابراہیمی کہتے ہیں۔ اسے چاروں طرف سیاہ اینٹوں کی ایک دیوار نے گملے کی صورت میں گھیرا ہوا تھا۔ اس درخت کے حوالے سے کئی روایات مشہور ہیں۔



بلوط ابراہیمی

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی کی چھاؤں میں ایک خیمہ میں اپنی عمر کا بڑا حصہ گزارا۔ یہیں آپ کو یہ بشارتیں ہوئیں کہ آپ کے دو عدد صاحبزادوں اور ایک کزن حضرت لوطؑ کو نبوت سے سرفراز کیا جائے گا اور یہ سلسلہ آپ کی دعا کے نتیجے میں سر زمین حجاز میں ہمارے محترم نبی آخر الزماں ﷺ کی صورت میں محسن انسانیت کا روپ دھار کر پورا ہوا۔ آپ ہی نے حضرت لوط علیہ السلام کو یہیں سے صدم اور گمراہ کی بستیوں کی جانب رخصت کیا تھا۔ رشد و ہدایت کے پیغام کے ساتھ جب حضرت لوطؑ رخصت ہو رہے تھے اور صحرائے یہود کی مسافت سامنے تھی تو آپ کی آنکھیں بڑے بھائی ہونے کے ناطے اشکبار تھیں۔ یہاں یہ خیال بھی بہت عام ہے کہ گو اس درخت کی عمر لگ بھگ ساڑھے تین ہزار برس ہے، لیکن ہر سال اس میں کوئی نہ کوئی ہری شاخ پھوٹ پڑتی ہے۔ جس سال کوئی شاخ نہیں پھوٹے گی، اس سال دجال دنیا میں قتال اور فساد کے لیے قرب و جوار سے نمودار ہو جائے گا۔ ہم نے گارڈ کا شکریہ ادا کیا اور باہر چلے آئے۔

\*\*\*\*\*

itsurdu.blogspot.com

”آج تو آپ نے ہیبرون بہت گھوم لیا؟“ قادر کے لہجے میں ایک طنزیہ سی چھیڑ خانی تھی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ ”بطور سیاح یہ میرے لیے واقعی بہت انوکھا تجربہ تھا۔“ وہ اس جواب سے محظوظ ہوا اس نے اپنی حتمی رائے ظاہر کی کہ لوگ چونکہ یہاں بسوں اور بلٹ پروف گاڑیوں میں فوجیوں کے جلو میں آتے ہیں انہیں ہیبرون کا کوئی اندازہ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ کیسی سیاحت ہے، اس نے اپنے مشاہدے کو احتجاج میں اس اعلان کے ساتھ بدلا کہ اسے شدید بھوک لگی ہے لہذا اس سے پہلے کہ میں کوئی اور مطالبہ دید و شنید کروں، پیٹ پوجا کرنا لازم ہو گیا ہے۔

میں نے بھی کہا جو پہلا دھابہ ملے وہاں کھانا کھائیں گے۔ ہم پہاڑوں میں سے گزر رہے تھے، اب سڑک پر کسی بستی کا کوئی نشان نہ تھا۔ الخلیل کے اس بھونچال سے گزرنے کے بعد اب میری طبیعت میں عجب شائنتی تھی۔ اس نے جب یہ پوچھا کہ میں کیا کھانا پسند کروں گا تو میں نے بھی جواب دیا کہ پھیکے بے لطف عربی کھانے کھا کر میری طبیعت بے زار ہو گئی ہے، مجھے تو پیٹ میں دھوم مچاتی مرچوں والے کھانے کی طلب ہے۔ قادر میرے مطالبے پر گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر اچانک پوچھنے لگا کہ کیا میں اصلاً پاکستانی ہوں۔ مجھے اس کے اس سوال پر تاؤ آگیا اور میں نے اسے کہا کہ اگلی مرتبہ جب ملیں گے تو میں برتھ سرٹیفیکٹ ساتھ رکھوں گا۔ نہیں مجھے ایک بات یاد آرہی ہے یہاں سے پانچ کلو میٹر دور حلقول کا قصبہ ہے۔ چند سال پہلے تک وہاں پاکستانی کھانے مل جاتے تھے۔ یہ کسی پاکستانی کا ہوٹل تھا۔ مجھے لگا کہ ہوٹل اور میرے مطالبے نے اسے بہت دور ماضی میں کہیں دھکیل دیا ہے۔

اس انجان محل و وقوع میں پاکستانی ہوٹل اور وہ بھی کسی پاکستانی کا، یہ ایسا انکشاف تھا کہ میں اپنی سیٹ پر نیم دراز حالت سے اُچھل کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر نگاہیں گاڑ کر یہ اطمینان کرنا چاہا کہ واقعی وہ ہوش و حواس میں ہے۔ میں مزاق نہیں کر رہا۔ میں یہاں بہت عرصے پہلے آیا تھا۔ یہ حلقول کا قصبہ ایسا نہیں کہ سیاح یہاں آئیں۔ مجھے پتہ نہیں وہ پاکستانی اب تک زندہ ہے کہ نہیں۔ وہ جب بھی کافی عمر رسیدہ تھا۔ اس کا یہ انکشاف مجھے ایک ایسی غلط فہمی لگی جس پر میں نے پیشگی ہنسنا شروع کر دیا۔ میری یہ حرکت اسے ایک آنکھ نہ بھائی لیکن اس نے اپنی برہمی پر قابو پاتے ہوئے کہا کہ وہ زندہ ہوا تو تمہیں پاکستانی کھانا مل جائے گا۔ میں نے بھی اس کے جھوٹ کو گھر پہنچانے کے لیے کہا کہ 65 ممالک کی سیر کے بعد اگر کسی پاکستانی سے مجھے مل کر خوشی ہوگی تو وہ آج اور اسی قصبے حلقول میں ہوگی۔ ابھی چلو، فوراً چلو۔ آج کی شام اپنے پاکستانی کے نام

عشق کی داستان ہے پیارے۔۔ آگے اپنی زبان ہے پیارے



قادر کو جانے کیوں خیال آیا کہ میری زندگی میں اب تک کے تجربات اور تحیرات ناکافی ہیں۔ بہانہ طعام کا تھا مگر جو داستان اب کھلنے والی ہے اس کا اندازہ تو اس بے چارے کو بھی نہ تھا وہ نادانستگی میں مجھے ہیبرون سے لے کر ایک ایسے دریائے محبت میں اتر گیا جو ایسا پایاب (کم گہرا جس میں پاؤں زمین کو لگ جائیں) بھی نہ تھا۔

راجہ مریمز نے جو کہانی مجھے سنائی وہ عشق کی ایسی داستان ہے کہ دنیا کا بہترین فلم ساز اس پر سن فلاور، دی ٹریٹل، دی نوٹ بک یا دی تھیف آف دی بک قسم کی فلم بنا سکتا ہے۔ اس قصہ ہیبرون کا ہے جسے ہیبرون کا ایک دفعہ اور لٹ گئے

حلمول، ہیبرون سے پانچ کلو میٹر دور ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ ایک سوئی سی بستی، صاف ستھری، کچھ سوگوار سی۔ یہاں ٹریفک بہت کم اور بازار کچھ چپ سے تھے۔ لوگ بھی گھروں سے بہت کم باہر دکھائی دے رہے تھے۔ وہ کار سڑک کنارے کھڑی کر کے کسی کا پتہ پوچھنے چل پڑا۔ میں سستانے اور باہر کا جائزہ لینے کے لے کر سے نکل آیا۔ فضا میں ایک پہاڑی مقام کی سی سوندھی خوشبو تھی۔ ایک لڑکا انگور بیچ رہا تھا۔ میں نے دو شیکل کے خرید لیے۔ یہاں حلمول کے پھل اور انگور پورے فلسطین میں بہت مشہور ہیں۔ میرے منہ میں وہ ایک شیرینی بن کر گھل گئے۔



اتنی دیر میں قادر نظر آیا اس کا چہرہ دمک رہا تھا گویا اسے وہ گم گشتہ تابوت سیکنہ مل گیا ہو جسے یہودی ڈھونڈ رہے ہیں۔ آتے ہی اس نے اعلان کیا کہ میں بہت ہی نصیب دار ہوں وہ تمہارا پاکستانی ہم وطن بوڑھا ابھی تک بقید حیات ہے۔ اس نے میری خوش قسمتی کا سہرا ایک بوڑھے کے سر باندھا جس کے بارے میں وہ کھوج لگانے نکلا تھا۔ مجھے اس کے لہجے کی کھنکھناہٹ بہت بھلی لگی۔ یہاں حلقول میں پاکستانی، میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس وقت وہ دکان پر بھی موجود ہے آؤ اس کے پاس چلیں۔ ہم ایک پہاڑی ڈھلوان سے اتر کر نیچے آئے تو سڑک کے اختتام پر وہاں ایک مطعم تھا۔ کھانے کا ہوٹل یعنی مطعم ابو داؤد۔ یہاں سے ساری وادی کا خوب صورت نظارہ دیکھا جاسکتا تھا۔ مطعم سے کباب، حمس اور نان کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔

مطعم میں داخل ہوتے ہی میری نگاہیں اس پاکستانی چہرے کو ڈھونڈنے میں لگ گئیں جس کی دید کے لیے مجھے یہاں لایا گیا تھا۔ کاؤنٹر پر ایک ادھیڑ عمر کا پھرتیلا عرب بیٹھا تھا جو طعام سے متعلق گاہکوں کے بلوں کی رقم کا لین دین کر رہا تھا۔ عین اس کے پیچھے ایک چھوٹی سی جگہ میں سر جھکائے گویا کہ حالت مراقبہ میں ایک بوڑھا بیٹھا تھا۔ قادر نے ہماری آمد کا اعلان با آواز سلام سے کیا۔ کاؤنٹر پر بیٹھے مالک نے بہت خوش مزاجی سے ہمارے سلام کا جواب دیا اور ہمیں نشست اختیار کرنے کی دعوت دی۔ قادر نے میرے اندازے کے مطابق اسے عربی میں کہا کہ میں ایک پاکستانی ہوں اور وہ مجھے اس کے والد سے ملانے لایا ہے۔ یہ سن کر اس نے بوڑھے مرد کی جانب لٹی کہہ کر آواز لگائی۔ قادر کہاں چوکنے والا تھا اس نے مصرعہ طرح لگایا کہ وہ ان سے ملانے کے لیے پاکستان سے ایک بڑے خاص مہمان کو لایا ہے۔

مجھے نہیں لگتا کہ دنیا کو کوئی اداکار ان جذبات کی عکاسی کر سکتا ہے جو اس وقت اسے بوڑھے کے جھریوں زدہ چہرہ پر انوار پر بادل بن کر چھا گئے۔ بے یقینی، اضطراب، طرب بے اختیار وہ کونسا رنگ تھا جو اس چہرے پر ان ساعتوں میں نمایاں نہ ہوا۔ وہ بہت تیزی سے اپنی نشست سے اٹھ کر میری جانب بڑھتے چلے آئے۔ یقین جانے باپ کی انہیں کیفیات بے پایاں کا کچھ رفیق تو ان کا صاحبزادہ وہ کاؤنٹر پر بیٹھا غریب سیٹھ بھی تھا۔ جس کے باپ کو یہ نعمت غیر مترقبہ یوں اچانک ملی تھی۔



بیت عمر، فلسطین

بڑے میاں نے میرے پاس آن کر السلام علیکم کہا اور میرے جواب کے بعد دوسرا سوال میری وطنیت پر داغ دیا۔ اس کی برسوں سے گنگ اردو زبان پر عربی لب و لہجہ غالب آچکا تھا۔ میرے مثبت جواب پر انہوں نے مجھے گلے لگایا۔ اس گلے لگنے میں اس باپ کی شفقت کا رنگ چھایا ہوا تھا جو بہت عرصے بعد اپنے گم شدہ بیٹے سے ملا ہوا۔ انہوں نے سب متجسس ناظرین مطعم کے سامنے اعلان کیا کہ وہ نصف صدی کے بعد پہلی مرتبہ کسی ہم وطن سے مل رہے ہیں۔ ان کی آواز کپکپا رہی تھی۔ آنکھیں اشک بار تھیں اور مسرت دیدنی۔ چار سوا یک نعرہ مر حبا بلند ہوا۔ بیٹے نے فوراً ایک ٹیبل صاف کر کر نسبتاً ایک خاموش کونے میں ہمیں بٹھادیا۔ قادر نے ہم دونوں کو چھوڑ کر اپنے کھانے پینے کا اہتمام کیا اور وہ وہاں بیٹھے ہوئے عربوں کی ایک ٹولی میں گھس گیا۔

ایسے مواقع پر پاکستانیوں کا جو اگلا سوال ہوتا ہے وہ متوقع تھا اور جب انہوں نے میرے شہر کا نام پوچھا تو میرا فی الفور جواب تھا ”راولپنڈی“۔ چچا غالب کو کلکتے کے ذکر پر جو تیر دل میں لگا تھا (کلکتے کا جو تو نے ذکر کیا اے ہم نشین۔۔ اک تیر میرے سینے میں مارا کہہ ہائے ہائے) کچھ وہی حال ان بزرگوار مشفق کا ہوا۔ آنسوؤں کی ایک جھڑی بہہ نکلی جو ان کی سفید ریش کو چمکاتی ہوئی نم کر گئی۔ ان کا آبائی تعلق راولپنڈی کے علاقے ٹینج بھاٹا سے تھا اور نام تھاراجہ ممریز۔ اس دوران میں ان کا صاحبزادہ عربی کافی کی دو پیالیاں لے آیا۔ اسے اپنے باپ کی نازک جذباتی کیفیت کی بہت فکر تھی۔ جب اسے میری جانب سے یقین ہو گیا کہ ہر چیز قابو میں ہے تو وہ مسکراتا ہوا چل دیا۔

راجہ ممریز نے جو کہانی مجھے سنائی وہ عشق کی ایسی داستان ہے کہ دنیا کا بہترین فلم ساز اس پر سن فلاور، دی ٹریٹل، دی نوٹ بک یا دی تھیف آف دی بک قسم کی فلم بنا سکتا ہے۔ اس قصہ ہیر رانجھا کو سنتے ہی پنجابی ایک دفعہ اور لٹ گئے آپ کو تو یاد ہی ہو گا کہ اردو کے ایک پرانے شاعر انشانے کہا تھا ع

سنایا رات کو جو قصہ وہ ہیر رانجھے کا

ہم اہل درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

ان کی کہانی ان کی زبانی سنتے ہوئے مجھے کئی دفعہ لگا کہ میرے نیچے سے کبھی کرسی تو کبھی زمین سرک گئی ہے اور میں فضا میں کسی پیناٹاشرڈ لمحے میں معلق ہو گیا ہوں۔ اس داستان الم ناک کا آغاز سن ساٹھ کی دہائی میں ہوا۔ راجہ جی کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ وہ خود بھی ایک عام سے نوجوان تھے۔ ان کا وہاں نان کاری بازار میں مصالحوں کا تھوک کا کاروبار تھا۔ یہ راجہ جی کی دنیا نہ تھی۔ وہ ہمہ وقت باہر جانے کے خواب دیکھتے تھے، ادھر ادھر سے پیسے جمع کر کے والد صاحب سے سفر کی اجازت مانگی تو انکار ہو گیا۔ وہ باز نہ آئے، لگے رہے لیکن والدین جب ٹس سے مس نہ ہوئے تو ایک دن چپ چاپ انہیں بتائے بغیر برطانیہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ برطانیہ جانے کے لیے سن ساٹھ کی دہائی میں ویزہ مطلوب نہ ہوتا تھا۔ ارادہ یہ تھا کہ چند ماہ بعد گھوم پھر کر آئیں گے تو ان کا شوق اور والدین کا غصہ دونوں ہی ٹھنڈے پڑ چکے ہوں گے۔

\*\*\*\*\*



لندن پہنچ کر راجہ جی کو وطن عزیز کی کچھ زیادہ فکر نہ رہی۔ گھر سے لائی ہوئی جمع پونجی جلد ہی وہاں سیر و تفریح کی نذر گئی۔ اب کیا کریں! سولماز متوں کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ نوکریوں کا وہاں ان دنوں ویسا کال نہ تھا، جیسا اب ہے۔ انگریز مالدار تھے۔ ہمارے ہاں سے جو دولت لوٹ کر لے گئے تھے وہ اب تک چل رہی تھی۔ ٹونی بلیئر جیسے Losers اور مکار افراد ابھی تک وہاں وزیراعظم نہ بنے تھے۔ راجہ صاحب کبھی ایک نوکری پکڑتے تو کبھی دوسری، اور یوں گزارا ہونے لگا۔ جیب بھاری ہوئی تو حضرت کو پیرس دیکھنے کا شوق چرایا۔ وہاں سے نیلجیم اور پھر ہالینڈ، یہاں تک کہ سارایورپ کھنگال ڈالا۔

اسی دوران قسمت سے ان کی ملاقات لندن میں ایک اردنی رئیس زادے جمال سے ہو گئی۔ وہ اردن کے ایک بڑے تاجر گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ لندن میں اسے اپنے لیے ایک قابل بھروسہ سا نگران (کیئر ٹیکر) کی ضرورت تھی جو وہاں لندن میں اس کا گھر بار سنبھال سکے۔ جمال نے معقول مشاہرے کے عوض راجہ جی کو اپنے ہاں ملازم رکھ لیا اور دونوں کی خوب نبھنے لگی۔

پنڈی کی وہ سن ساٹھ کے دنوں کی نیم اندھیری گلیاں دور کہیں دلوں میں اب بھی اپنے ٹمٹماتے تمقموں سے روشن ہیں۔ راجہ صاحب اپنے لڑکپن کے ساتھیوں کے والدین کے ڈر سے جھپٹے چھپاتے گھر لوٹنے کے مناظر نہیں بھولے۔

دو برس بعد جب تعلیم مکمل کر کے جمال نے واپسی کا رخت سفر باندھا تو راجہ جی کو بھی ساتھ ہی رکھ لیا۔ وہاں ان کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ ان کے اردن میں کئی مقامات پر تعمیراتی پروجیکٹس چل رہے تھے راجہ صاحب جگہ جگہ گھومتے رہتے۔ حج کیا۔ شام دیکھ آئے۔ ایک دن جمال اور انہیں کاروبار کے سلسلے میں ححول کے پاس ایک قصبے بیت العمر آنا پڑا تب ححول اور بیت العمر دونوں ہی مملکت اردن کا حصہ تھے۔ وہاں پہنچے تو شام ہو گئی تھی۔ جمال میاں تو اپنے جائیداد اور رشتہ داروں سے معاملات نمٹانے میں لگ گئے۔ حضرت راجہ صاحب کو سگریٹ کی طلب نے ستایا تو آگ لینے نکل کھڑے ہوئے۔ اس تگ و دو میں حضرت موسیٰ کی طرح پیغمبری تو نہ ملی مگر بیوی مل گئی۔ قیام گاہ سے کچھ دور ایک ڈھلوان سے نیچے اترے تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ علاقہ پہاڑی تھا اور منظر دل فریب۔

راستے میں کسی سے ماچس مانگ کر سگریٹ سلگایا۔ ایک درخت کے نیچے کسی پتھر پر سستانے بیٹھے تو سامنے نگاہ پڑی۔ ایک چھوٹے سے مکان کی بالکونی میں ایک نسوانی سایہ سر سر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد پردے کے پیچھے سے وہ نکل کر سامنے بالکونی میں آیا تو وہ ایک دلکش و دل فریب دوشیزہ تھی۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں تو راجہ جی کی دنیا وہ دنیا نہ رہی۔ پورے فلسطین اور اردن میں بیت العمر کی حسیناؤں کی دھوم ہے۔ سارے عرب میں اپنے حسن کے حوالے سے مشہور خود ملک شام والیاں بھی انہیں اپنے سے حسین مانتی ہیں۔ ہمیں اس تذکرے سے یہ خوف ہو گیا ہے کہ جس طرح سیالکوٹ اور شیخوپورہ کے فریبہ اندام اڑھتی اور تھوک بیوپاری سوات، قندھار، چترال کی

حسیناؤں کو ایکسپورٹ کے نئے آرڈروں اور بڑھتی ہوئی خوشحالی سے دوسری بیوی بنانے پہنچ جاتے ہیں وہ اس رازدروں کو جاننے کے بعد بیت العمر کا رخ نہ کر لیں۔

راجہ جی کا دل جس حسینہ نے چرایا، وہ بی بی تو ان سب سے بڑھ کر تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ انسان بن گئی ہے کرن ماہتاب کی۔ نگاہ مٹانے کی تاب کس کو تھی۔ اس کی پہلی نظر کیا اثر کر گئی کہ ایک بجلی گری اور راجہ صاحب ختم شد۔ وہ بالکونی میں پردہ ٹھیک کرنے آئی تھی اور راجہ ممیز خان لٹے بچے بھاٹا والوں کی زندگی خراب کر گئی۔ مسکراہٹ کا جو تاثر اس کے چہرے پر پھیلا تھا وہ اس کی دلی کیفیات کا بھی عکاس تھا۔ ہمارے جیسا کوئی ہوتا تو کہہ دیتا کہ اس دل کے دریدہ دامن میں دیکھو تو سہی، سوچو تو سہی، جس جھولی میں سوچید ہوئے اس جھولی کا پھیلا ناکیا۔ راجہ ممیز کی زندگی کا اگر آپ مشاہدہ کریں تو اس میں اپنے مرکز سے بچھڑ جانے کی بہت VULNERABILITY تھی۔

جمال کے دل پر راجہ جی کی داستان الفت نے عجب رنگ جمایا۔ اس نے روانگی میں ایک دن تاخیر کی اور اگلے دن عرب روایات کے مطابق تحفے تحائف سے لدا پھندا گاؤں کے مکھیا کے ساتھ لڑکی کے گھر رشتہ لے کر پہنچ گیا۔

اس رات تو راجہ جی مانوا نگاروں پر سوئے۔ اس بے چاری کا حال بھی۔ ”چاند میں کچھ خیال کرتے ہیں۔۔ میر صاحب کمال کرتے ہیں“ والا ہی ہو گا۔ مگر عورتوں کے معاملے میں اور خاص طور پر مرتخ اور زہرہ برہی عرب عورتوں کے بارے میں باہوشاہ صاحب کا دامن تھام کر، دل دریا سمندروں ڈونگے، کون دلاں دیاں جانے ہو کو ہی آخری خبر سمجھیں۔ عاشق لوگ تو رملے کملے ہوتے ہیں دنیا بڑی سیانی۔ سو حضرت راجہ جی اگلے دن اس مقام اسی پتھر پر اسی وقت موجود تھے۔ ہماری جرات نہ ہوئی کہ پوچھ لیتے حالانکہ دیواندہ کی فلم تیرے گھر کے سامنے ان دنوں ہی ریلیز ہوئی تھی ممکن ہے راجہ صاحب گنگنا بھی رہے ہوں کہ اک گھر بناؤں گا تیرے گھر کے سامنے۔ چند لمحے گزرے تھے کہ وہ دوشیزہ بھی پھر بالکونی میں آگئی۔ دونوں کا دل کوئی وائی فائی کنکشن سے جڑا تھا۔ اب کہ اس طرف سے بھی نگاہوں میں آشنائی اور قبولیت کا پیغام تھا۔ اسی دعوت رفاقت کو راجہ جی نے جو ان دنوں اپنی بھرپور جوانی کے ایام کا لطف لے رہے تھے اور۔ دل سے قبول کیا ممکن ہے وہ بھی ہمارے جیسے خوب رو بھی ہوں۔ وہ بیبیاں جو انگلستان میں ہمارے ساتھ پڑھتی رہی ہیں یا ہم پیشہ رہی ہیں۔ آپ ان سے تصدیق کر سکتے ہیں۔ ہم ان دنوں ایسے نہ تھے جیسے اب لوگوں کے پھٹے، پرانے، سیاہ، شکستہ دل جوڑ جوڑ کر ہو گئے ہیں۔ شام کے شہر حلب یعنی Aleppo جیسے۔ راجہ جی کہ لیے اس بی بی کو اپنی بیوی بنانے کا فیصلہ عمر کے حساب سے کچھ مشکل نہ تھا۔ دل آجائے تو مڑتے نہیں۔ کم بخت مرد ہوتے ہی ایسے ہیں ہمارے کچھ ہم عمر دوست آج بھی بے چینی سے ایشوریا رائے کی طلاق کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہماری بات کو خاتون ہونے کے ناطے بہت دل پر نہ لیں۔ پنڈی کے سب مرد ایسے نہیں ہوتے۔ ایک راجہ جی تھے۔ ایک ہم ہیں، ہماری بیگم گواہ ہیں۔

جس دن انہیں عمان لوٹنا تھا اس دن راجہ جی نے اپنی پریم کتھا سیٹھ جمال کو سنا ڈالی۔ جمال کا معاملہ وہی تھا جو شکوہ جواب شکوہ کے وقت علامہ اقبال کا تھا کہ ع

کچھ جو سمجھا تو میرے شکوے کو رضواں سمجھا

جمال کے دل پر راجہ جی کی داستان الفت نے عجب رنگ جمایا۔ اس نے روانگی میں ایک دن تاخیر کی اور اگلے دن عرب روایات کے مطابق تحفے تحائف سے لدا پھندا گاؤں کے مکھیا کے ساتھ لڑکی کے گھر رشتہ لے کر پہنچ گیا۔ باپ کم بخت کو پہلا اعتراض تو یہی تھا کہ ممریز ٹینج بھاٹا۔ راولپنڈی کا ہے عرب نہیں۔ اس کے اکاڑی پچھاڑی کا بھی کچھ پتہ نہیں۔ جمال نے ٹوپی تو باپ کے قدموں میں نہیں رکھی مگر اس غریب پر ذاتی ضمانتوں اور اپنے تعلقات کا ایسا بوجھ ڈالا کہ وہ پسچ گیا۔ ایک شرط منوانے سے پھر بھی باز نہ آیا۔ دولہے میاں اپنا Period of Probation پورا ہونے تک یہاں بیت العمر میں ہی رہیں گے۔ جب تک لڑکی والے ان کے چال چلن کے حوالے سے شکبہ نہیں ہو جاتے۔ تب تک یہاں ٹکے رہنا ہے۔ ایک دفعہ یہ اطمینان قلب ان کی معصومہ اور اس کے والدین کو ہو گیا کہ وہ بھلا مانس ہے وہ اس کے بعد انہیں جہاں جا کر گھر بسانا ہو اس کی اجازت دیں گے۔ ایک ہفتے بعد وہ سب عمان سے رات لے کر آئے اور راجہ ممریز خان کا نکاح ہو گیا۔ یہ 1966 کا موسم خزاں تھا۔ راجہ ممریز کے سرکار ہوٹل یہی ہے جہاں ہم بیٹھے ہیں مطعم ابو داؤد۔ وہ ان کا ہاتھ بٹانے میں لگ گئے۔ ان کے انگور کے باغات بھی تھے۔ راجہ جی میں بہت خوبیاں تھیں سسرال والے تو کیا اب سارا قصبہ ان کی شرافت اور رکھ رکھاؤ کے گن گاتا تھا۔ دس ماہ گزرے تو اللہ نے انہیں احمد میاں سے نوازا۔ یہ وہی حضرت ہیں جو کاؤنٹر پر بیٹھے ہیں۔ راجہ جی کا منصوبہ تھا کہ بیٹے اور بیوی کے ساتھ راولپنڈی پہنچیں گے تو ناراض والدین کا دل چاند جیسی پیکر شرافت بہو اور گلابی اجلے پوتے کو دیکھ کر پرانے گلے شکوے بھول جائے گا۔ مدتیں ہوئیں وہ گھر چھوڑنے کے بعد خط لکھتے تھے تو پنڈی سے اس خط کا کوئی جواب بھی نہ آتا تھا۔ تقدیر کے ہاں کچھ اور فیصلے لکھے تھے۔ 1967ء میں جنگ لگ گئی بیت العمر اور حلقول اردن سے چھن گئے۔ ان پر اسرائیل قابض ہو گیا۔ راجہ ممریز پاکستانی سے اسرائیلی ہو گئے۔ نہ جہاں میں کوئی اماں ملی۔ سرحدوں پر ایسے پہرے لگ گئے کہ وطن ہی بدل گیا۔ اردن کا وہ علاقہ جہاں وہ رہتے تھے وہ اسرائیلی مملکت کا حصہ بن گیا۔ جمال سیٹھ کا وطن اردن ہو گیا تو ان سے بھی رابطہ نہ رہا۔ تقدیر کے زلزلے نے راجہ جی کے سب پرانے رشتے برباد کر ڈالے۔ سرکار کا بھی کچھ عرصے میں انتقال ہو گیا۔ لے دے کہ ایک سال تھا اسے اسرائیلی فوجیوں نے کسی غلط فہمی کی بنیاد پر گولیوں سے بھون ڈالا۔ سارا سسرال ختم ہو گیا۔ سرکار کا روبرو بار تنہا انہیں سنبھالنا پڑا۔ راجہ صاحب کے چار بیٹے ہیں تین بیٹیاں۔ بیگم اللہ کو پیاری ہو گئی ہیں۔ وطن واپس آن کر اولاد کو راولپنڈی دکھانے کا خواب اب گم گشتہ سرحدوں، امیگریشن حکام کی سرد مہری اور ان پر طاری بڑھاپے کی تھکاوٹ کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔ پرانی جینز والی یادیں باقی ہیں۔

پنڈی کی وہ سن ساٹھ کے دنوں کی نیم اندھیری گلیاں دور کہیں دلوں میں اب بھی اپنے ٹٹمٹاتے تمقموں سے روشن ہیں۔ راجہ صاحب اپنے لڑکپن کے ساتھیوں کے والدین کے ڈر سے چھپتے چھپاتے گھر لوٹنے کے مناظر نہیں بھولے۔ سردیوں کے ایام میں انہیں یاد ہے



کہ وہ چھت پر اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ دھوپ سینکا کرتے تھے۔ ماں کے ہاتھ کا آگوشٹ اور توے سے اتارے ہوئے گرم پھلکوں کے لقمے اب بھی ان کے ہر ذائقہ طعام پر حاوی ہیں۔ وقت مگر بہت ظالم ہے۔ اب راجہ جی ایک فلسطینی ہیں۔ جس عورت کی خاطر سب کچھ چھوڑ دیا وہ بھی بے وفا نکلی۔ تین برس ہوتے ہیں ان کو داغ مفارقت دے کر ملک عدم کی راہی ہو گئی۔ راجہ جی اسے اس کا بھی دوش نہیں دیتے۔ اسے کینسر نے بستر علالت پر لا پٹھا تھا۔ ورنہ وہ تو ایک پیکر وفا و حیا تھی۔ وہ یوں چھوڑ کر جانے والی نہ تھی۔

اب راجہ جی کی بس ایک ہی تمنا ہے کہ موت آئے تو اپنی شریک حیات کے پہلو میں انہیں بھی دفن دیا جائے۔

راجہ صاحب کی داستان حیات سن کر مجھے بھوک اور وقت کا کوئی احساس ہی نہ رہا۔ داستاں ختم ہوئی تو عبدالقادر وہاں پڑے تخت پر لمبی تانے سوچکا تھا۔ ریسٹورنٹ گاہکوں سے خالی ہو چکا تھا لیکن راجہ جی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر چکی تھیں۔ انہیں میزبانی کے باب میں کوتاہی کا احساس ہوا آنکھ سے آخری آنسو پوچھتے ہوئے بھرائی آواز میں معذرت کی کہ انہوں نے دل کا بوجھ ہلکا کرنے میں مجھے کھانے کا تو پوچھا تک نہیں۔ درد اب جا کے اٹھا چوٹ لگے دیر ہوئی، والا معاملہ تھا۔

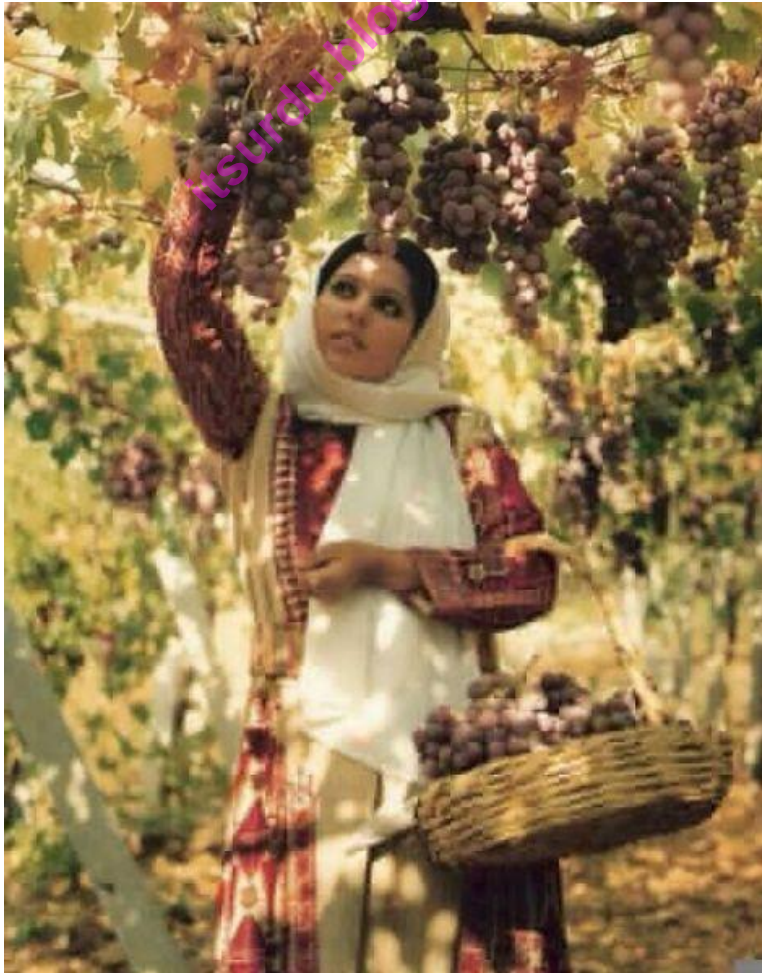
ان کے سوال کی بازگشت میں، ان کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے۔ ان کے اور اپنے شہر پنڈی اور ان کے علاقے ٹے بھاٹا کو یاد کرتے ہوئے میرے دماغ میں، میرے دوست، میرے مترجم دیوان صاحب کا سنایا ہوا، جون ایلینا کا وہ شعر گونج رہا تھا ع

داستاں ختم ہونے والی ہے  
تم مری آخری محبت ہو

\*\*\*\*\*

میں وہ بدنصیب ایسا اہل دل اور اہل وطن تھا جو ایک مدت بعد راجہ صاحب کو ملا تو وہ اپنی داستان حسرت سنا سنا کے روئے۔ اس واردات اشک باری و مقام آہ نغاں میں میری بھوک مٹ گئی اور ان کی میزبانی کو تاہی کے بستر پر سسکیاں لے کر منہ ڈھانپے پڑی رہی۔ داستان دل کا معاملہ وہی ہے کہ چاہے وہ کتنی بھی پرانی ہو بقول مصطفیٰ زیدی: کہنے والے کے لیے سب سے نئی رہتی ہے

راجہ صاحب نے جب مجھے کھانے کا پوچھا تو مجھے ایسا لگا کہ میری رال اندر ہی اندر کہیں ٹپک پڑی ہے۔ راجہ صاحب نے میری اشتہا کو یوں اور بھی آتش شوق سے ہم کنار کیا کہ انہوں نے ہم پنڈی والوں کا پسندیدہ کھا جاکیا ہے۔ وہ مُصر تھے کہ یہ سب پکوان عمر عزیز کے اس حصے میں بھی میرے لیے خود ہی تیار کریں گے۔ سچ مانے تو میرے لیے اب اس پیشکش سے انکار کا کوئی جواز نہ بچا تھا۔ کھڑکی سے باہر دیکھا تو سامنے سرخ اور نارنجی سورج پہاڑی ڈھلوانوں پر ادھر ادھر بکھرے گھروں پر سے اپنی آخری کرنیں سمیٹ رہا تھا۔ ان گھروں کے برآمدوں میں اور دالانوں میں اب دھیمے دھیمے قمتے ٹمٹما رہے تھے۔ انگوروں کے باغات میں البتہ جگنوؤں کے جھرمٹ دکھائی دے رہے۔ حلقول تاریخ کے گمنام صفحات میں سانس لیتا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ عوام کی ایک بڑی اکثریت اس سے لا تعلق اور نا آشنا ہے۔ مجھے جانے یہ خیال کیوں گھیرے بیٹھا ہے کہ میں یہاں شاید دوبارہ کبھی بھی نہ آ پاؤں۔ میرے جیسے من موجی، جسے شہر شہر گھومنے کا بہت اتفاق ہوتا ہے، یہ سوگوار کیفیت کم ہی اپنی گرفت میں لیتی ہے۔ آج کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔



اس سوگواری کا سودا میں نے تجسس میں عین اس وقت کر ڈالا جب راجہ صاحب مجھے چھوڑ کر باورچی خانے کی طرف بڑھنے لگے۔ میرے اس سوال کے جواب میں کہ کیا یہاں کوئی تاریخی عمارت یا مقام دل چسپی ہے تو راجہ صاحب نے ایک مانوس سی حیرت کا اظہار کیا۔ ایسی حیرت جو ہر پنڈی والے کو اس وقت ہوتی ہے جب اس سے کوئی اپنا کوئی انہو نا سوال کرے۔ راجہ صاحب کا بھی خیال تھا کہ حضرت داؤد کو یروشلم اور گرد و نواح کی بستیاں بسانے کا مشورہ شاید میں نے دیا تھا۔ وہ حیرت سے فرمانے لگے کہ کیا مجھے یہ نہیں معلوم کہ حضرت یونس علیہ السلام کا مزار اسی شہر میں ہے۔

میں نے اس موقع پر اپنی رائے ظاہر کی کہ حضرت یونسؑ کا معاملہ ایسا ہے کہ تین مقامات پر آپ کی تدفین ظاہر کی جاتی ہے۔ ایک تو موصل کے پاس نینوا میں، دوسرا مشہد جو اسرائیل کا ایک قصبہ ہے اور تیسرا یہ ہمارا حلقول۔

حضرت یونس علیہ السلام کے مقبرہ عالی کے حوالے سے پچھلے دنوں کچھ تصاویر اور دل خراش مناظر میں نے میڈیا پر دیکھے تھے۔ اسے داعش نے موصل عراق کے قریب برباد کر دیا تھا۔ میں نے جب ان مناظر کو ذہن میں حوالہ بنا کر پوچھا تو ایک اچھے پاکستانی کی طرح وہ دامن بچا گئے اور کہنے لگے تاریخ کا تو مجھے کوئی پتہ نہیں مگر سب لوگ کہتے ہیں کہ مسجد یونس یہاں ہے اور آپ کا مدفن بھی۔ یہاں سے وہ زیادہ دور نہیں اگر ہسبرون کی سیاحت نے مجھے تھکا نہیں دیا تو میں وہاں جاسکتا ہوں۔ تب تک کھانا تیار ہو جائے گا۔ میں نے جھٹ پٹ اجازت لی اور چل پڑا۔

حلقول کی خاموش گلیوں پر سرشام ہی ایک خاموش سی سوگواری نے چادر ڈال دی تھی۔ ہوا میں خنکی بھی تھی۔ سارے اسرائیل اور فلسطین میں یہ وہ واحد مقام ہے جہاں سردیوں میں تو اتر سے برف پڑتی ہے۔ اپریل کی اس شام میں چٹکیاں لیتی خنکی تھی۔ چند سو میٹر چلنے کے بعد میرے سامنے کہیں سے خود بخود مسجد یونس نمودار ہو گئی۔ مسجد کے اندر داخل ہونا بہت خوشگوار تجربہ تھا، امام صاحب اگر مجھے ہار لے ڈیوڈسن موٹر سائیکل پر سوار ڈر بن جنوبی افریقہ یا برمنگھم کی کسی شاہراہ پر ہفتے کی رات ملتے تو بغیر گٹار کے بھی راک اسٹار لگتے۔ مجھے سے ملے تو بہت خوش ہوئے۔ یہاں بہت ہی کم سیاح آتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو شاید یہ بھی ہو۔ مغرب کی نماز کی امامت سے فارغ ہو کر وہ مجھے مسجد کے کونے میں ایک مقبرے کے پاس لے گئے۔ فاتحہ خوانی سے فارغ ہو کر میں نے راجہ صاحب والا سوال ان سے بھی کر ڈالا۔ وہ کہنے لگے دنیا میں صرف دو مزارات کو مستند سمجھو، حضرت ابراہیمؑ اور ہمارے آقائے دو جہاں محمد مصطفیٰ ﷺ کی مسجد نبوی میں آرام گاہ۔ باقی سب مقابر کے بارے میں اس قدر تضادات ہیں کہ حاضری کا موقع ملے تو عزت سے فاتحہ پڑھو، جو مسلمان پر ایسے موقع پر فرض ہے۔ دوسروں کے جذبات اور عقیدت کا احترام کرو اور چپ چاپ رخصت لو۔ اسی میں عافیت ہے۔ میں نے اس موقع پر اپنی رائے ظاہر کی کہ حضرت یونسؑ کا معاملہ ایسا ہے کہ تین مقامات پر آپ کی تدفین ظاہر کی جاتی ہے۔ ایک تو موصل کے پاس نینوا میں، دوسرا مشہد جو اسرائیل کا ایک قصبہ ہے اور تیسرا یہ ہمارا حلقول۔ میرا خیال ہے کہ چونکہ وہ نینوا کی بستی (جو اس وقت بابل اور



اب عراق میں واقع ہے) میں بغرض تبلیغ دین اسلام بھیجے گئے تھے۔ لہذا یہ بات ممکن نہیں کہ وہ یہاں آئے ہوں۔ میرے اس معترضانہ مشاہدے کو انہوں نے بہت خاموشی سے سنا اور پھر کمال آہستگی اور شائستگی سے یوں گویا ہوئے کہ ممکن ہے انہیں وہاں اللہ کے عذاب کی آمد کی اطلاع دی گئی ہو۔ وہاں کے لوگ بہت سرکش و باغی تھے۔ وہاں کا طبقہ اشرافیہ آپ کی غربت اور بے چارگی کو بہت تحقیر سے دیکھتا تھا، ان کو بہت ایذا بھی پہنچاتا تھا۔ اسی لیے وہ چل پڑے ہوں۔ قصے یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ یہ فیصلہ کہ وہ تیونس کی جانب بحری راستے سے چلے جائیں، اُن کا اپنا فیصلہ تھا۔ اللہ کی جانب سے ابھی یہ حکم نہیں آیا تھا۔ اللہ نے ان کی اس کشتی کو مبتلائے طوفان کر دیا۔ اس زمانے میں یہ رسم تھی کہ اگر سمندری کشتی کسی طوفان کا شکار ہو جائے تو لوگ تیروں کے ذریعے فال نکالتے تھے کہ کہیں مسافروں میں کوئی ایسا مسافر تو نہیں جو مالک سے جان چھڑا کر خیانت اور چوری کر کے بھاگ رہا ہو۔ اسے کشتی سے سمندر میں پھینک دیا جاتا۔

حضرت یونس کا نام ہر مرتبہ فال نکالنے پر جب سامنے آیا تو ان ناخداؤں کا یہ باور کرنا مشکل تھا کہ وہ مجرم ہیں کیوں کہ ان کی اور دیگر مسافروں کی اکثریت آپ کے تقوے اور اعلیٰ کردار سے بخوبی آگاہ تھی۔ امام صاحب نے میری جانب بہت غور سے دیکھا اور فرمانے لگے نیک لوگ اگر کوتاہی یا حکم عدولی کرتے ہیں تو ان کی سزا عام آدمی سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہ اس لیے کہ اس طرح کے افراد کی کوتاہی کے مضمرات اور بگاڑ عام آدمی کی کوتاہی اور حکم عدولی سے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ معاشرہ اس کی وجہ سے بہت اٹھل پھل کا شکار ہوتا ہے۔



حضرت یونس علیہ السلام کے مزار کا اندرونی منظر

بالآخر انہیں کشتی سے پھینک دیا گیا اور ایک بڑی مچھلی شاید وہیل نے انہیں نگل لیا۔ وہ اس کے پیٹ میں کتنے دن رہے اس کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔ کم از کم مدت تین دن اور زیادہ سے زیادہ چالیس دن بتائی جاتی ہے۔ وہاں ان کا ورد بس آیت کریمہ تھی جو سچی توبہ کا سب سے پہلا اعتراف ہے۔ اللہ کو اس توبہ استغفار پر رحم آگیا اور انہیں مچھلی نے جافا کے پاس ساحل پر آن کر باہر اگل دیا۔ اس وقت

ان کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ مچھلی کے پیٹ میں قیام کی وجہ سے آپ کی جلد وہاں موجود تیزابیت نے جھلسادی تھی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس پر فضا مقام تک آن پہنچے۔ یہ جو مقبرہ ہے اسی کمرے میں ہے جہاں آپ نے سال بھر قیام کیا تھا۔ یہیں پر آپ کی خوراک کے انتظام کے لیے کدو کا درخت بھی اگا دیا تھا۔ ان کا زیادہ تر وقت عبادت میں گزرتا تھا۔ سال بھر کے قیام کی وجہ سے ہی قصبے کو حل (قیام) حول (سال بھر) کہتے ہیں۔

امام صاحب کہنے لگے کہ صحت یاب ہو کر وہ نینوالوٹ گئے تھے۔ واپسی کا سفر ان کے لیے بہت خوشگوار ثابت ہوا۔ ان کی قوم اپنی پرانی روش ترک کر کے دین الہی کو اپنا چکی تھی۔ اللہ نے ان پر اپنی مہربانیوں کا باب پھر سے کھول دیا تھا۔ یہاں تاریخ کو ایک دو شاخہ چبھ جاتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں عمر کا باقی حصہ انہوں نے اپنے لوگوں میں ہی گزارا، یہیں آپ کا وصال ہوا اور یہیں وہ مزار تعمیر ہوا جسے داعش نے موصل میں ڈائنامیٹ سے اڑا دیا۔ ایک بیان یہ بھی ہے کہ وہ واپس یہاں حلحول لوٹ آئے تھے۔ یہی ان کا مدفن سمجھا جاتا ہے۔ میں نے سوال کیا کہ اگر یہ مزار انہیں کا ہے اور یہ تعویذ موجود ہے تو ان کی اصل قبر کہاں ہے؟

کمرے کے نیچے ایک بہت بڑا غار ہے۔ وہ گویا ہوئے۔ اس تک رسائی ناممکن سی ہے۔ شاید وہ مقبرہ وہاں ہو۔

میں نے امام صاحب کا اس سیر حاصل تعارف پر تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور معظم ابو داؤد کی جانب لوٹ آیا۔ یہاں اس وقت گاہکوں کی بھرمار تھی۔ قادر صاحب راجہ صاحب کے بیٹے کے اسٹنٹ منیجر گلاسنبالے بیٹھے تھے۔ مجھے ان سالوگوں کے دل میں جلد گھر کرنے کا ہنر نہ آیا۔ راجہ صاحب مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ہم نے اپنی پرانی مخصوص نشستیں سنبھالیں۔ ویٹر بھاگ بھاگ مٹی کی دہکی ہوئی دو بڑی ہانڈیاں اٹھالایا۔ ڈھکن ہٹے تو اندر سے خوشبو بن کر راولپنڈی برآمد ہو گیا۔ میرے مشام جاں روشن ہو گئے۔ چکن کڑھائی پر پتلے کترے ہوئے ادرک کے ٹکڑے۔ ہری مرچیں اور تازہ ہر ادھنیا۔ ساتھ ہی دال ماش جو اگر کھانے میں شامل نہ ہو تو ہم پوٹھوہاری سات کورس کے ڈنر سے بھی بھوکے ہی اٹھ آتے ہیں۔ نان بھی بالکل ہمارے جیسے تھے۔ اللہ اللہ کیا مہربانیاں ہوئیں۔ کھانا ختم ہوا تو قادر چھوٹے بچوں کی طرح پہلو میں آن کر بیٹھ گیا کہ اب لوٹ چلیں اندھیرا چھا گیا ہے۔ راجہ صاحب نے بھی اس کی انگریزی سن لی وہ تو بہت عمدہ انگریزی بولتے ہیں۔ وہ میرا ہاتھ تھام کر بولے جانے کی باتیں جانے دو۔ میری داستان تو سن لی پاکستان کا کوئی احوال نہیں ہوا۔ میرے پنڈی کا کوئی تذکرہ نہیں ہوا، کیسی محفل ہے کہ ابتدا ہی نہیں۔ میرا شہر مجھے بھول گیا تو کیا! ہم نہ اسے بھلا سکے۔ میں نے ان کی یہ فرمائش سن کر قادر کو کہا کہ یہاں نہ میری بیوی، نہ میرے بچے۔ ہوٹل میں کوئی میرا منتظر بھی نہیں لیکن تمہاری ضد ہے تو چلتے ہیں۔ راجہ صاحب نے کچھ ایسی ملتجی نگاہوں سے قادر کو دیکھا کہ وہ بھی دھوپ میں رکھی برف بن گیا۔ فون کر کے بیگم کو بتایا کہ یہاں حلحول میں وہ اپنے کسی بھولے بسرے کزن کے پاس رات کو قیام کرے گا۔ دس بارہ سال بعد بیوی کو میاں کی اور فرشتوں کو مولوی کے رزق کے کوئی فکر نہیں رہتی۔ سو وہ بھی خوش ہوئی ہوگی۔ قادر نے کزن کے گھر کا راستہ لیا اور راجہ صاحب میرا بازو تھام کر مجھے اپنے گھر لے چلے۔ تین کمروں کے گھر میں وہ اپنے دو عدد بڑے بیٹوں اور ان کے اہل و عیال کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کا گھر ایک چھوٹی

سی پہاڑی چوٹی پر واقع ہے۔ گھر پہنچتے ہی انہوں نے اپنے الخلیل، بیت عمر، حلحول میں بکھرے ہوئے خانوادے کے دیگر افراد کو فون پر بلوالیا۔ وہ بھی ایک کے بعد ایک آناً فاناً پہنچ گئے۔ کون تھا جو نہ آیا ہو، بہوئیں، بیٹے بیٹیاں، پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں۔ مجھے بھی ایسا لگا میرے اپنے گھر کے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ دس بجے تک وہ سب رخصت ہو گئے تو ہم برآمدے میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے ایسا لگا کہ ان کے ہاتھ میری صورت میں الہ دین کا جن ہاتھ لگ گیا ہے جو ان کے لیے پلگ جھپکتے ہی پنڈی طشتری پر اٹھالائے گا۔ ان کے ذہن میں پنڈی کے حوالے سے سوالات کا ایک طوفان تھا ہوا تھا۔ جو کچھ یادوں میں سما یا تھا، سب ہی نکال کر میرے سامنے رکھ دیا، وہ افراد اور مناظر تو سبھی بدل گئے۔ اب ان کو کہاں سے ڈھونڈیں۔ میرا مسئلہ یہ تھا کہ کچھ افراد جن کا وہ پوچھ رہے تھے وہ میری پیدائش سے پہلے ہی کہیں ادھر ادھر ہو گئے۔

میرے بڑوں سے میں نے کچھ کاسر سری سا احوال سن رکھا تو سو بیان کرتا رہا تاکہ ان کے دل خوش فہم میں پنڈی کے بارے میں جو یادیں باقی ہیں وہ میری بے احتیاطی سے کہیں نادانستہ طور پر چکنا چور نہ ہو جائیں۔ جب وہ تذکرہ چھیڑتے تو میں گاہے بہ گاہے سوالات یا تجزیے کا ہلکا سا تڑکا لگا دیتا تھا۔ میری ایک ہی کوشش تھی کہ ان کے خوابوں اور خیالات کا پنڈی میری حق گوئی اور بے باکی کی وجہ سے کہیں ان سے نہ چھن جائے۔

اگلی صبح میری آنکھ کچھ دیر سے کھلی۔ بہت دیر تک یقین نہ آیا کہ میں کہاں آرام فرما ہوں۔ کھڑکی سے باہر دیکھا تو قصبہ حلحول بھی میری طرح اونگھ ہی رہا تھا۔ راجہ صاحب نے میرے لیے خصوصی طور پر ناشتے پر پراٹھے بنوائے۔ ناشتہ ختم ہوا تو قادر بھی طلوع ہو گیا۔ رخصت ہوئے تو راجہ ممیریز آف ٹینج بھاٹا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ انہیں اپنا چھوٹا بھائی راجہ سلطان یاد آ گیا اس کا بابو محلے میں موٹر سائیکلوں کا شوروم ہے۔ ان کا حکم تھا کہ پنڈی پہنچ کر میں اسے ضرور ڈھونڈوں اور جب میں سرکار بری امام جاؤں تو ان کی جانب سے چادر ضرور چڑھاؤں۔ میں نے سب وعدے پورے کرنے کی بات کی اور نیم خوابیدہ حلحول سے چل پڑا۔ یرو شلم کے راستے میں میری سوچوں کو کوئی کنارہ نہیں مل پارہا تھا۔ ہر مسافت کا انجام زندگی بھر کی جدائی نہیں ہوتا مگر تقدیر اگر کوئی رکاوٹ کھڑی کر دے تو کوئی ویزہ کوئی پاسپورٹ کوئی سواری اس کے دوسرے پار نہیں جاسکتی۔

\*\*\*\*\*



راجہ مریز کے ہاں سے واپسی پر میرے ذہن میں تقدیر سے متعلق بہت سے سوالات منڈلاتے رہے۔ میں ان کی زندگی کو لمحوں کی ایک ایسی خطا سمجھتا ہوں جس کی سزا صدیوں کو ملی۔ عبدالقادر بھی غیر محسوس طریقے پر تمام مسافت کے دوران میں چپ تھا۔ اسے ممکن ہے راجہ مریز کے بارے میں کچھ کچھ معلوم ہو مگر وہ ان کے پنڈی کے پس منظر اور پنجاب کے عظیم شاعر وارث شاہ کے بقول ”دکھ درد و چھوڑے عمراں دے عاشقاں صادقان دی تقدیر ہووے۔“ کا کوئی درد اور ادراک نہ رکھتا تھا۔ اس کی سرخ آنکھوں کے بارے میں میرے سوال پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ رات بھر تاش کھیلتا رہا ہے۔

یروشلیم پہنچ کر اس نے مجھے ہوٹل اتارا اور خود اپنی نیند کی کمی پوری کرنے گھر چل دیا۔ ہوٹل کی لابی میں مجھے دیکھ کر منیجر رفیق صاحب اپنی سیٹ سے اچھل پڑے اور بھاگ کر میری طرف آئے۔ میری سلامتی کی انہیں فکر تھی۔ یہ تفکر ان کے چہرے پر بھی عیاں تھا اور تو اتر سے پوچھے گئے سوالات میں بھی۔ میں نے انہیں جب حلقول میں اپنے قیام شب کا بتایا تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اُن کا اصرار تھا کہ ایسی کوئی نوبت آئے تو میں انہیں ضرور بتاؤں۔ اُن کا خیال تھا کہ میں بے رحم موساد کے ہاتھ لگ گیا ہوں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اسرائیل میں سنگ دل قانون تو بہت ہے مگر حقوق نہیں۔ ان کے ہاتھ لگ جاؤ تو زندہ برآمد ہونا مشکل ہے۔ ان کے چہرے پر تفکرات اور ان کے جذبات میں اڈتی سچائی دیکھ کر مجھے معافی مانگنے میں اور جلدی سے کمرے کا رخ اختیار کرنے میں ہی عافیت دکھائی دی۔ شاور لے کر کپڑے تبدیل کر کے میں جب ٹیرس پر آیا تو دن ابھی اپنے شباب پر تھا۔ میرا دل نہ چاہا کہ میں یہ عرصہ اس کمرے میں گزار کر وقت ضائع کروں انہیں لمحات میں مجھ پر یہ کوتاہی عیاں ہوئی کہ میں نے یہاں کی اہم ترین عمارت دیوار گریہ تو ابھی تک نہیں دیکھی۔ یہ سوچنا تھا اور اگلے دس منٹ میں خاکسار یروشلیم کی سڑکوں پر موجود تھا۔ دیگر شہروں کی نسبت یروشلیم میں ایک اپنائیت ہے۔ میں اس کا نفسیاتی تجزیہ کروں تو اس کے عوامل میں فلسطینیوں کی خودداری، دلبری، مجبوری، مظلومیت کے ساتھ ساتھ اس شہر کی وقت کے ساتھ مسلسل ہم آغوشی اور تاریخی بہاؤ کا بھی بہت ہاتھ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے یہاں کے لوگوں سے ایک فطری میلان محسوس ہوتا ہے۔ یروشلیم نے مجھے دوست کے گلی محلے اور بیٹھک کی مانند اپنا لیا ہے۔ یوں تو ہر شہر کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ آپ کی طبیعت کے سُر اس شہر کے مزاج سے مل جائیں تو یہ احساس یگانگی محسوس ہوتا ہے۔



مجھے اور میرے دوست اقبال دیوان کو نیویارک کی جدیدیت، دولت اور امارت میں ایک شور اور آپ کو دبوچ لینے والی خصلت کا احساس ہوتا ہے۔ لندن بہت گستاخ اور نسل پرست ہے اور برسلز کا ذائقہ بیمار کے سوپ جیسا ہے۔ ان سب سے ہٹ کر یروشلم ایسا ہے کہ جیسے لڑکی میکے میں آگئی ہو یا بھٹکا ہوا داد محمد یونان سے نجل خوار ہونے کے بعد واپس پنڈ دادن خان آگیا ہو۔ یہاں تکلف برطرف ہے۔

مسجد اقصیٰ کے محافظ تھوڑے اور جذبہ ایمانی سے لیس ہیں۔ مگر دیوار گریہ کا معاملہ ایسا ہے کہ اس کے احاطے میں داخل ہونا ایسا ہے گویا آپ سندھ یا پنجاب پولیس کے آئی جی صاحب کے دفتر یا نیٹو کے ہیڈ کوارٹر میں داخل ہو رہے ہیں۔ جا بجا فوجی، ہر طرف دھاتی کھوجی (metal detectors) ایسا لگتا ہے کہ اس کی ہواؤں کا ہر جھونکا آپ کو خوش آمدید کہہ رہا ہے۔ آج اس کی تنگ گلیوں سے

گزر اتو اس میں ایک عجب سی اپنائیت کا احساس ہوا۔ میں نے اس کی تین بڑی نشانیاں ازبر کر لی ہیں۔ یہ تینوں حیرت ناک طور پر مذہبی عمارات ہیں۔ ایک تو ہماری اپنی مسجد اقصیٰ ہے دوسرا کلیسہ آلام ہے اور تیسری وہ آہوں سے پتی ہوئی اور اشک ہائے عصیاں سے تردیوار گریہ۔ یہ ایک دوسرے کی ضد میں سب کی سب ایک کلو میٹر کے دائرے میں گھسی ہوئی ہیں۔ شہر والوں نے سوچا ہے کہ اہل عقیدت خود ہی تقدیس کے شیرے میں لتھڑے اور اپنے جنوں کی راستی پر مُصر انہیں ڈھونڈ لیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نشاندہی کے لیے کوئی بورڈ کہیں نصب نہیں۔ قربتوں میں دوری کا یہی ادراک بے پایاں ہے جو میرے سفر نامے کا عنوان بنا ہے۔ میں نے بھی قانون کی مناسبت سے جس میں ایک اصطلاح ADVERSE POSSESSION طویل جبری قبضہ استعمال ہوتی ہے جسے مناسب قانونی اہلیت نہ ہونے پر عدالت بادل ناخواستہ قابض کے حق کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ یہ قبضہ سر دست مملکت اسرائیل کا ہے۔ اہل یہود کو اپنے اصل دشمن عیسائی اتنے بُرے نہیں لگتے جنہوں نے ان کی بستیاں تاراج کر دی تھیں۔ قیمتی خزانے لوٹ لیے تھے۔ ان کا داخلہ یروشلم میں مدتوں ممنوع قرار دے رکھا تھا، کیوں کہ وہ تو وطن چھوڑ کر یورپ، آسٹریلیا، کینیڈا اور امریکا بھاگ رہے ہیں مگر فلسطینی اور عرب مسلمان ان کے لیے سوہانِ روح بنے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اسے اپنا مرکزی نقطہ حوالہ بنایا ہے۔

اس ایک کلو میٹر میں پتھر ملی، بل کھاتی اوپر نیچے ہوتی گلیوں کا جو جال ہے وہ ایک عام سیاح کے لیے بہت الجھاؤ کا باعث ہو سکتا ہے مگر ایک دفعہ محل وقوع سے آشنائی ہو جائے تو کھیل بچوں کا ہو جاتا ہے۔ میں آپ کو سمجھاتا ہوں کیسے؟ دمشق گیٹ سے آپ سیدھے چلتے چلے آئیں تو ایک سہ راہا آ جاتا ہے۔ دھیان رکھیں یہ پہلا سہ راہا ہے۔ بائیں جانب مڑ جائیں تو مسجد اقصیٰ آ جاتی ہے۔ دائیں ہاتھ کا مڑنا آپ کو کلیسہ آلام تک لے جائے گا اور سیدھے چلتے جائیں تو دیوار گریہ آپ کا راستہ روک لے گی۔

کلیسہ آلام Church of Sepulchre کے ارد گرد حفاظتی اقدامات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ مسجد اقصیٰ کے محافظ تھوڑے اور جذبہ ایمانی سے لیس ہیں۔ مگر دیوار گریہ کا معاملہ ایسا ہے کہ اس کے احاطے میں داخل ہونا ایسا ہے گویا آپ سندھ یا پنجاب پولیس کے آئی جی صاحب کے دفتر یا نیٹو کے ہیڈ کوارٹر میں داخل ہو رہے ہیں۔ جا بجا فوجی، ہر طرف دھاتی کھوجی (metal detectors)۔ سادہ لباس، رنگیں ادا غنچہ دہن، شیریں سخن خفیہ پولیس کی Kerv Maga میں سیکھی سکھائی سیاح نما حلف یافتہ کارکنان بقول چچا غالب ع اک ذرا چھیڑے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

آزمائش اور احتیاط کے ان سب مراحل سے گزر کر میں ایک بڑے سے احاطے میں آن پہنچا۔ اس احاطے کے سامنے سیدھے ہاتھ کی جانب یروشلم کے یہود کا علاقہ ہے اور بائیں جانب دیوار گریہ۔ یہاں سیاحوں کے درمیان اسرائیلی خفیہ پولیس کے اہل کاریوں گھل مل گئے تھے جیسا ہماری طرف کی عورتوں کی آنکھ میں کاجل۔ بہ لباس درست فوجی ان کے علاوہ تھے۔



دیوار گریہ کی زیارت پر کسی کے لیے کوئی پابندی نہیں لیکن ہفتے والے دن جو اہل یہود کا یوم السبت ہے، اس دن صرف یہود ہی یہاں آسکتے ہیں۔ مشتاقان دید کے لیے ستر پوشی کی شرط البتہ ہمارے مدرسوں والی ہے۔ ٹی شرٹ اور نیکروں میں مرد اور عورتیں دونوں ہی نہیں آسکتے، عورتیں ٹخنوں کے اوپر والے اسکرٹ پہن کر نہیں آسکتی ہیں۔ آدھی آستین مرد کی ہو یا عورت کی، دونوں پر پابندی ہے۔ سر ڈھانپنا دونوں کے لیے لازم ہے۔

سعودی عرب اور ایران کی طرح ان کے شرطے (مذہبی پولیس) بھی بہت سنگ دل اور حجت نا آشنا ہیں۔ وہ تو بھاولپور کے آدموں پر قربان جانیے کہ پاکستان میں بچت ہو گئی اور بقول اس وقت صدر بننے والے غلام اسحاق خان کے جنرل صاحب کا جہاز ہوا میں ”پٹ“ گیا۔ ورنہ بقول قیوم نظر

تم چلے جاؤ گے رہ جائیں گے سائے باقی  
رات بھران سے میرا خون خرابہ ہوگا

ان کے شرطوں میں ایک یہ زمین بھی نئی نکلی ہے کہ ان مذہبی پولیس والوں میں چاق و چوبند خواتین بھی حفاظت دین یہود کے لیے بھرتی کی گئی ہیں۔ مجال ہے ان کی دید بانی اور دیدہ دلیری سے کوئی بچ کر اپنی مرضی کا لباس پہن کر یہاں آجائے۔ بحث کی ان کے پاس بھی گنجائش نہیں۔ لباس درست نہیں تو دید کا یارا بھی نہیں۔

اس کے برعکس ہمارے ہاں تو پولیس کے جو اسپیشل یونٹوں میں چن چن کر تیری میری بیبیاں بھرتی کی گئی ہیں وہ نقلی برانڈز کے پرس اور چشمے لگا کر اصلی ہتھیاروں سے سیاست دانوں کے اپنے جیسے بیٹوں کی حفاظت کے لیے رکھا گیا ہے۔ ان کے محافظین خصوصی کی پوسٹنگ اگر یہاں دیوار گریہ پر ہوتی اور ان کی ڈیوٹی کے دوران میں یہودی عقیدے کے مطابق دیوار کے اس پار سے کاناجال آکر دنیا کو تہس نہس کر دیتا تو اپنے سیاسی تعلقات کے نشے میں سرشار ان پولیس والیوں کو اس کی آمد کی اطلاع بھی سما ٹی وی کے خبر نامے سے ملتی۔



اہل یہود کے ہاں دیوار گریہ سب سے مقدس مقام تصور کیا جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں حضرت داؤد علیہ السلام کی آمد سے ایک ہزار سال پہلے ایک عبادت گاہ کی تعمیر کا آغاز کیا۔ اسے بابل کے بادشاہ نے تعمیر کے 586 سال بعد برباد کر دیا، ستر سال بعد یہودی کچھ آسودہ حال ہوئے تو پھر سے ہیکل سلیمانی کی تعمیر کا آغاز ہوا۔ یہاں ان کے بادشاہ ہیرڈ نے حضرت عیسیٰ ابن مریم کی آمد سے انیس برس قبل بہت توسیع اور ترقی کا کام کیا۔ اس کے بعد روم کے بادشاہوں کی جانب سے ایک اور عذاب نازل ہوا اور اس کو لوٹ کر تاراج کر دیا گیا۔ ان کا تابوت سکینہ بھی اسی دوران غائب ہو گیا۔ موجودہ دیوار چونکہ اس احاطے کی بیرونی دیوار تھی، لہذا اسے درخور اعتناء نہیں سمجھا گیا۔ یہودیوں کے لیے وہ اس ہیکل سلیمانی کی آخری نشانی ہونے کی وجہ سے مقدس ترین مقام بنی ہوئی ہے۔

جب رومی یہاں حکمران بن گئے اور بعد میں یہ حکمران لادینیت چھوڑ کر عیسائیت کو اپنا بیٹھے تو انہوں نے یہودیوں پر بہت سختیاں کیں، یروشلم سے انہیں نکال باہر کر دیا گیا۔ انہیں اس شہر میں سال بھر میں صرف ایک دفعہ آنے کی اجازت ملتی تھی۔ اس محرومی پر یہودی بہت دل گرفتہ و گریہ ہوتے تھے۔ سال میں ایک دفعہ یہاں آتے تو دیوار کو لپٹ کر روتے تھے۔ عیسائی حاکمین اور ان سے وابستہ

افراد کے لیے یہ بہت قابل تمسخر و تضحیک موقع بن جاتا۔ انہوں نے ہی اس دیوار کو دیوارِ گریہ کا نام عطا کیا۔ خود یہودی اسے دیوارِ گریہ نہیں کہتے۔ وہ اسے اپنی عبرانی زبان میں ”کو تل“ مغربی دیوار کا نام دیتے ہیں۔ اس کی دراڑوں میں وہ اپنی دعائیں اور تحریری مطالبات اور منتیں اڑا دیتے ہیں۔ یہ اب ایک اچھا خاصا بین الاقوامی کاروبار ہے۔ وہ یہودی جو یہاں پہنچ نہ پائیں وہ ای میل کے ذریعے یہ دعائیں اور منتیں بھجوا دیتے ہیں جو ان کی جانب سے یہاں اڑا دی جاتی ہیں۔ میری تحویل میں بھی میرے ایک یہودی کرم فرما کی دی ہوئی ایک ایسی ہی منت ہے۔ مجھے اسے کسی مناسب مقام پر ٹھونسنا ہے۔

جب میں ایسے ایک مقام کے قریب رکاوٹیں عبور کر کے پہنچا تو آہ و بکا اور عزاداری کا ایک عجب منظر تھا، توریت کا باآواز بلند ورد جاری تھا۔ اسی تگ و دو میں مجھے ایتھوپیا والے حضرت شائم آمون دکھائی دے گئے۔ وہ بھی دیوار سے لپٹے ہوئے تھے۔ میں بہت خاموشی اور احترام سے ان کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنا سیاہ چہرہ دیوار کی جانب کیے دیوانہ وار کبھی آگے ہوتے تو کبھی پیچھے۔ انہی حرکات میں ذرا توقف ہوا تو ان کا چہرہ مجھے دیکھ کر کھل اٹھا۔ لمحے بھر کا توقف کیے بغیر انہوں نے باآواز بلند میری مذہبی رواداری، کشادہ دلی اور وسیع المشرقی پر مسرت کا بے پایاں و بے حساب اظہار کیا۔ وہ جتنا لگے کہ قدامت پسند مسلمان یہاں نفرت کے مارے نہیں آتے اور روشن خیال ڈر کے مارے۔ سو میں ان کے اپنے اندازے اور بیانیے کی رو سے کہیں درمیان میں بے خانماں حیرت و حسرت کا مارا، برباد کھڑا ہوں ساحل پہ۔

\*\*\*\*\*



اپنی ایستادگی وسطی کی وجہ سے مجھے یہ بھی ادراک ہوا کہ حضرت شائم آمون بہت چمک رہے ہیں، متحس ہیں، مبتلائے حیرت ہیں۔ میں نے ان تمام جذبات بے جا کو اپنے اظہار مختصر کی پتلی نائلون کی ایک ہی رسی سے باندھنا مناسب سمجھا اور انہیں بتایا کہ میرا ایک یہودی مریض ہے۔ جو جاں بہ لب ہے، سفر سے قاصر ہے۔ وہ خواہشمند تھا کہ میں اس کا یہ تعویذ مطالبات بہ حضور الہی پیش کر دوں۔

جس سرعت سے انہوں نے اپنی خدمات اس فریضہ گمنام کو انجام دینے کے لیے پیش کیں اس سے مجھے لگا کہ میں ان کی نظروں میں کچھ سرخرو سا ہو چلا ہوں۔ وہ آہستگی سے دیوار کے سیدھے جانب وہاں موجود انبوہ گریہ کو کاٹ کر آگے بڑھتے رہے۔ لکڑی کے اس برج پر سے جس سے غیر مسلموں کو اس احاطے میں آنے کی قطعی اجازت نہیں وہاں پہنچ کر انہوں نے مجھے اس دعائیہ رقعے کو رکھ دینے کی تجویز اس لیے دی کہ یہ حصہ اس معبد سلیمانی کے قریب ترین ہے جسے کم بخت رومی جرنیلوں نے تاراج کر ڈالا تھا۔

اس قربت کی وجہ سے اس کی قبولیت کے امکانات مزید روشن ہو جائیں گے۔ میں نے اس تجویز کو مناسب جانا۔ ان کوتاہ قد یہودیوں میں اپنی پوٹھواری بلند قامتی کالا بھ لیا اور ایک دوسرے سے قدرے ناراض دو قدیم اینٹوں کے درمیانی فاصلے میں سفید کاغذ پر لکھا، سرخ دھاگے سے بندھا، وہ دعائیہ رقعہ اڑس دیا۔

میرا اپنا خیال تھا کہ میں ان سے تخصیص مقام کے حوالے سے ضرور پوچھوں گا مگر وہ میرا دماغ پہلے ہی ناپ کر بیٹھے تھے، کہنے لگے کہ ”وہ محاورہ تو سنا ہے ناکہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ اس محاورے کا تعلق اسی دیوار سے ہے۔“ انہوں نے میرا ہاتھ تھاما اور کمال محبت سے مجھے باہر احاطے کی طرف لے چلے۔ میں نے غور سے ان کا چہرہ دیکھا تو جانے کیوں مجھے اس بوڑھے چہرے میں ایک روحانی سرور کی کیفیت دکھائی دی۔ اس پر ایک ایسی چھلکن تھی جسے وہ سنبھال نہیں پارہے تھے کہنے لگے کہ ”کچھ دل پتھر کے ہوتے ہیں اور کچھ پتھروں کا بھی دل ہوتا ہے“، جب انہیں احساس ہوا کہ وہ کچھ زیادہ ہی بول رہے ہیں تو لجاجت سے کہنے لگے کہ میرا امت پوچھو، اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔ دیگر اشیا کی طرح جذبات بھی ٹھیک سے سنبھال نہیں پاتا۔ مجھے یقین نہیں کہ پھر کبھی یہاں آنے کی مہلت ملے گی۔ ویسے بھی میرا یہاں آج آخری دن ہے۔ میں لوٹ کے جا رہا ہوں“

مورخین کی تحقیق کی رو سے حضرت داؤد علیہ السلام شہر کے جنوب مشرق میں مدفون ہیں۔ مورخ جوزیفس کے مطابق بادشاہ ہیرڈ نے ان کے مرقد عالیہ میں داخل ہونے کی کوشش کی تو ایک شعلہ سالپک کر اس کے تعاقب میں دوڑ پڑا، بمشکل پیچھا چھوٹا۔ ”مجھے آپ کے جذبات کا پورا ادراک ہے گو میرے محسوسات کی شدت ان کی ہم رکاب نہیں“ میں نے بھی انہیں اپنا شانہ تسلی سونپ دیا۔ وہ مزید خوش ہوئے تو مجھے حضرت داؤد علیہ السلام کے مزار عالیہ پر لے جانے کی پیشکش کر بیٹھے۔ یہ میرے لیے بونس تھا۔ ہم اپنی

یاترا کا اختتام وہیں پر کرتے ہیں۔ ماؤنٹ زیون شہر کی دیوار حصار سے باہر کی جانب ہے۔ روایت ہے کہ عثمانی خلیفہ سلیمان عالی شان کے حکم پر دو انجینئر شہر کے ارد گرد دیوار حصار و حفاظت بنا رہے تھے، وہ نادانی و نالائقی کی وجہ سے اس جبل صیہون (ماؤنٹ زائن) کو دیوار سے باہر رکھ بیٹھے۔ سلیمان عالی شان جب افتتاح کے لیے آیا تو اس قدر ناراض ہوا کہ ان کا انجینئر صاحبان کا پروانہ اموات جاری کر دیا۔ میں جب آمون شامون کے اس نو افراد کے قافلہ حبشہ کے ساتھ چلا تو مجھے لگا کہ ان کے ساتھ قدم ملا کر چلنا کتنا مشکل ہے۔ سب ہی ایتھوپیئن مرد وزن پیدا نشی ایتھلیٹ ہوتے ہیں۔

مورخین کی تحقیق کی رو سے حضرت داؤد علیہ السلام شہر کے جنوب مشرق میں مدفون ہیں۔ مورخ جوزیفس بیان کرتا ہے کہ بادشاہ ہیرڈ نے ان کے مرقد عالیہ میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہاں ایک عظیم گنجینہ گوہر موجود ہے۔ جب وہ حجرہ تدفین میں داخل ہوا تو ایک شعلہ سا لپک کر اس کے تعاقب میں دوڑ پڑا، بمشکل پیچھا چھوٹا تو سب کی ہمت ایسی ٹوٹی کہ کوئی اس مہم جوئی پر دوبارہ رضامند ہی نہ ہوا۔



حضرت داؤد علیہ السلام یہ ساز بجاتے تھے

حضرت عیسیٰ ابن مریم کے دنیا سے چلے جانے کے 135 سال بعد یہاں ”بغاوت بارخو خبا“ برپا ہوئی اور یہ مرقد عالیہ برباد ہو کر لٹ گیا۔ ہزار سال تک یہودی مورخین اور مفتیان دین اس کی کھوج کرتے رہے حتیٰ کہ بینجمن ٹیوڈیلا کو کہیں سے اچانک ماؤنٹ ڈیون پر ایک چرچ کی مرمت کے دوران میں اس مرقد اکرام کا پتہ چل گیا اور بس پھر کیا تھا دیکھتے ہی دیکھتے موجودہ مرقد کھڑا ہو گیا۔ اس مرقد کے احاطے میں داخل ہوں تو پہلی نظر ایک سنہری محسمے پر پڑتی ہے جو ربط (HARP) بجارہا ہے۔ مرقد میں داخل ہونے کا دروازہ تنگ ہے۔ یہاں انگریزوں کے بنائے ہوئے ہمارے پرانے برجوں اور پیرس کی لور آرٹ گیلری کی طرح فوٹو کھینچنا سخت منع ہے۔ خلاف ورزی کرنے والے کو حوالہ پولیس کر دیا جاتا ہے۔ پہلی منزل پر اب بھی اس باز نطنی چرچ کی کچھ باقیات موجود ہیں۔ اس کے چھوٹے سے کمرے میں حضرت داؤد علیہ السلام محو استراحت ہیں۔ یہاں بھی مشتاقان دید اور عقیدت کا ایک انبوہ کثیر جمع تھا۔ ہر طرف ہل ہل کر توریٹ پڑھی جا رہی تھی۔ یہاں پہنچ کر شائم آمون اور ان کے قافلے عقیدت میں شامل افراد نے اپنے چوغوں سے اپنے اپنے توریٹ کے نسخے کھینچ نکالے اور جھوم جھوم کر یک زباں ہو کر ان کا ورد شروع کر دیا۔

میرے مسلک کے حساب سے فاتحہ لازم اور وہاں کے محاصمانہ ماحول کی وجہ سے یہ غیر معقول اصرار تھا۔ وہاں چار سو قدامت پسند یہودی موجود تھے۔ ہر کوئی ہاتھ اٹھا کر ہلا کر اپنی عقیدت کا اظہار کر رہا تھا۔ میں نے بھی ہمت پکڑی اور فاتحہ کے لیے ہاتھ بلند کر لیے۔ میری رسم فاتحہ پر کسی نے کوئی کلمہ اعتراض بلند نہ کیا تو میں نے شائم سرکار کے کان میں آہستگی سے کہا کہ میں باہر اس کمرے میں جہاں حضرت داؤد کا مقبرہ عالیہ ہے، وہاں ان کا منتظر ہوں گا۔ ایک بیان کے مطابق اس مقبرے سے متصل ایک کمرہ وہ بھی ہے۔ جہاں حضرت عیسیٰ ابن مریم نے اپنا آخری طعام کھایا تھا۔ انگریزی میں اسے Last Supper کہتے ہیں۔ اسے مشہور بنانے والوں میں لینوارڈو ڈاونچی کی اس نام کی شاہکار پینٹنگ بھی ہے۔ خود ہمارے اپنے صادقین کی شہرت کا باعث پیرس میں ان کی بنائی ہوئی یہ پینٹنگ بنی۔ یہ سن پچاس کا آخری سال تھا۔ شغال، گواں اور پکاسو اور دیگر افراد نے بہت بھیانک تصاویر بنانے کا آغاز کر دیا تھا۔ صادقین پر اس تحریک کا رنگ بہت غالب تھا۔ صادقین کی طعام آخر والی یہ تصویر خود حضرت عیسیٰ کے حواری دیکھ لیتے تو جو تلوار پیٹرنے رومی سپاہیوں کو گرفتاری کے وقت مارنے کے لیے اٹھائی تھی مگر جسے حضرت عیسیٰ کے اس مشہور عالم قول کے حوالے سے واپس داخل نیام کر لیا تھا کہ

”Smite not. For those who live by the sword , die by the sword“

اس سے کم از کم صادقین کا سر ضرور قلم کر دیتے۔ اس کمرے میں جہاں تیرہ افراد کی یہ آخری دعوت طعام ہوئی تھی، یہاں پانچویں صدی تک ایک چرچ ہوتا تھا اس کا نام صیہون مادر کلیسیہ کل Zion Mother of all churches ”تھا۔ اسی زمانے میں اس کمرے کی شہرت آخری طعام گاہ کے طور پر ہوئی تھی۔ یہ ایک خالی کمرہ ہے۔ دیواروں پر کشید کردہ تصاویر وقت کے ساتھ معدوم ہوتی چلی گئی ہیں۔ یہاں چند تصاویر کھینچ کر میں باہر آ گیا۔ شائم اور ان کے رفقاء دین بھی چلے آئے۔ انہیں ہوٹل اور ہوائی اڈے پہنچنے کی جلدی تھی۔ شائم نے مجھے بہت گرم جوشی سے گلے لگایا پھر ملنے کے وعدے و وعید ہوئے فون نمبر کالین دین بھی ہوا۔ میں نے وعدہ کیا کہ ”میں ایتھوپیا کی قدیم بستی Axum دیکھنے آؤں گا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہودیوں کا گم شدہ تابوت سکیئہ یہاں ایک کلیسیہ میں موجود ہے۔ اس کا مزہ تم سے اہل علم و سلوک کی رفاقت میں اور بھی آئے گا“ اس نے مجھ پر گہری نگاہ ڈالی اور کہنے لگا کہ تمہارے اندر جو



ایک کھوجی سیاح چھپا ہوا ہے اسے قرار نہیں آئے گا۔ ”I know you will come, ” He gave me a deep look۔ میں اگر زندہ ہوا تو تمہیں یہ سب حتیٰ کہ وہ تابوت سکیں بھی بہت ہی قریب سے دکھاؤں گا۔ یہ وعدہ ہے۔ رات ہوٹل میں جو لمبی تان کر سویا تو فون کی گھنٹیوں نے نیند کو صور اسرافیل کی طرح برباد کر دیا۔ میری ہیلو سے پہلے ہی دوسری طرف سے گالم گلوچ اور لعن طعن کے وار پر وار ہونے لگے۔ اگلی جانب سے میرے پاکستانی، ناقابل اعتبار ہونے سے لے کر خود پسند، اپنی ذات میں انجمن ہر طرح کی شائستہ دشنام تھیں۔ یاد نہیں آرہا تھا کہ دنیا میں اب ایسا کون سا انسان زندہ نہیں بچا جو مجھ سے اتنا بے تکلف ہو کہ نیند سے یوں جگائے۔ میں نے ٹکفا پوچھ لیا کہ ”حضرت اپنا تعارف تو کرائیں۔“

میرے اس اصرار نے ان کے اشتعال میں مزید اضافہ کیا۔ میں وہ ہوں جو تمہاری کھال اتار کر تمہیں جنوبی افریقہ میں مگر مجھ کے تالاب میں پھینک سکتا ہے۔ میں تمہارا دوست احمق لانس ہوں۔“

مجھے یاد آیا کہ لانس لاسر سن جنوبی افریقہ سے تعلق رکھنے والا Anaesthetist تھا۔ ہم جو ہانسبرگ میں کئی برس تک آپریشن کے دوران میں رفیق کار ہوتے تھے۔ اس نے پانچ سال پہلے الیا Aliya کیا تھا۔ الیا (گھر واپسی)۔ کیا لاجواب انسان تھا۔ دیانت تو اس کی ہڈیوں کے گودے میں سمائی تھی، محبت اس کے ہر عمل کا حصہ تھی اور قابلیت میں اپنی مثال آپ۔ وہ ایک ہسپتال میں شعبہ بے ہوشی Anaesthesia کا سربراہ تھا۔ فون بند ہوا تو میرے دماغ میں وقت کا پہیہ اُلٹا گھومنے لگا۔ یاد آیا کہ آٹھ برس پہلے مجھے مملکت چاڈ میں تعینات اقوام متحدہ کے ادارے سے منسلک ایک ڈاکٹر صاحب کا فون آیا تھا۔ وہ میرے پاس ایک پانچ سال کے بچے کو بغرض علاج بھیجنا چاہتے تھے۔ اس کی سانس کی Trachea نالی ایک عجیب بیماری کی وجہ سے اب قریب قریب مکمل بند ہو چکی تھی۔ اگر اسے مستقل طور پر وینٹی لیٹر سے جوڑے رکھو تو وہ زندہ رہ سکتا تھا ورنہ وہاں سے ہٹتے ہی مرنے کے قوی امکانات تھے۔ بچے کو چاڈ سے جب میرے ہسپتال لایا گیا تو میرا اپنا حال بُرا تھا۔ کیونکہ میری معلومات اس بیماری کے حوالے سے نہ ہونے کے برابر تھیں۔ دنیا کے مختلف ممالک میں دوستوں کو پیشہ ورانہ رہنمائی کے لیے فون کیا تو وہاں بھی ایک ٹھنڈی سانس سنائی دی۔ ریسرچ اور لائبریریاں سبھی خاموش تھیں۔ بچہ مسلمان گھرانے کا تھا اور چاڈ میں رہنے کی وجہ سے والدین انگریزی سے نابلد۔

مجھے دیکھتے تو اللہ اللہ کی صدائیں بلند کرتے تھے، رور و کر دعائیں کرتے تھے۔ یہ لڑکا ان کی چار بیٹیوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ میرے لیے کسی اس کیس کو چھیڑنا جس کی مجھے معلومات ہی نہ ہوں، پیشہ ورانہ آداب کی خلاف ورزی تھی مگر دوسری طرف انسانی جان کا مسئلہ تھا۔ کئی دفعہ سوچا جی کڑا کر کے والدین کو جواب دے دوں کہ بچے کو واپس لے جائیں۔ بالآخر میں نے ہمت پکڑی والدین کو اعتماد میں لیا اور ایک بے حد خطرناک طبی طریقہ کار اختیار کرنے کا سوچا۔ مجھے اس کے لیے ایک بے حد مضبوط اعصاب والے اور اتنے ہی قابل Anaesthetist کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر لانس کو طبی تفصیلات اور ضروریات سے آگاہ کیا تو تاؤ کھا گیا کہ میں پاگل تو نہیں ہو گیا۔ مجھے جب اس نے بضد دیکھا اور والدین کو پر اعتماد تو میرا ساتھ خوش دلی سے دینے پر رضامند ہو گیا۔ ہم نے اگلے دن ایک جانور کے دل سے

وہ بڑی شہ رگ Aorta نکالی جو دل سے نکل کر باہر دماغ تک جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ضروری پیوند کاری کی تاکہ اسے انسانی جسم کے لیے قابل قبول بنا دیا جائے۔ بچے کی اپنی سانس کی نالی نکال دی اور یہ نالی لگادی۔ صرف آپریشن میں ہی گیارہ گھنٹے لگے۔ اللہ کا شکر ہے اس آپریشن نے مجھے دنیا بھر میں بطور ایک ماہر سرجن کے شہرت بخشی۔ اس میں شاید جہاں میرے اپنے والدین بچے کی ماں باپ کی دعاؤں کا کردار تھا وہیں ڈاکٹر لانس کی اس دن میرے ساتھ لمحہ بہ لمحہ موجودگی اور مدد کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جس دن بچہ ہسپتال سے اپنے پیروں پر گھر جا رہا تھا تو سارا ہسپتال اظہار تشکر سے اشک بار تھا۔ اللہ اسے ہر بیماری اور بلا سے محفوظ رکھے۔ وہ ان دنوں تیرہ سال کا گبر و شہزادہ ہے۔ لانس کو میری موجودگی کی اطلاع ڈاکٹر کلوری نے دی تھی۔ اسے تمہارے ہوٹل کا نام یاد تھا، لہذا تمہیں تلاش کرنا کچھ ایسا مشکل ثابت نہ ہوا۔ آپ کو تو یاد ہوگا کہ یہ کلوری وہی نیک دل بی بی ہے جس کا ہم نے اپنی دوسری قسط میں تذکرہ کیا تھا۔ اس بے چاری کا پاکستانیوں نے فیس بک پر ناک میں دم کر دیا ہے۔ مدتوں کی شادی شدہ، ازدواجی طور پر آسودہ، دنیا میں اپنے پیشے میں نامور افراد اور اپنے دین سے خوش اس خاتون کو کوئی اپنی بیوی بنانا چاہتا ہے تو کوئی مسلمان کرنا چاہتا ہے تو کوئی مرد ہشیار و بے کار اس سے اسرائیل میں پاکستانیوں کے لیے ملازمت کے مواقع تلاش کرنے کی فرمائش کرتا ہے۔

ہم سب آج سات بجے شام جمع ہوں گے۔ میں نے تل ابیب کے بہترین ڈاکٹروں کو ہمارے بہترین ہوٹل میں تم سے ملانے کے لیے ڈنر پر بلایا ہے۔ سات بجے شام میں تمہیں لینے ہوٹل آجاؤں گا۔ تیار رہنا۔ یہ میرے لیے بڑی خوشی کی بات تھی۔ اسرائیل میں اس وقت دنیا بھر کے بہترین ڈاکٹر جمع ہیں۔ میرے لیے پرانے ساتھیوں سے بھی ملنے کا موقع تھا اور ان میں سے اکثر وہ تھے جو کہیں نہ کہیں میرے ساتھ کانفرنسوں وغیرہ میں شریک رہے تھے۔

\*\*\*\*\*

لائسنس کا فون بند ہوا تو میرے دل کو ایک عجیب سی سوغواری اور بے زاری نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس لیے نہیں کہ کل میں اسرائیل سے رخصت ہونے والا تھا بلکہ اس لیے کہ مجھے آج اہل خانہ کے لیے شاپنگ کرنی تھی۔ یہ میرا سب سے اہم مسئلہ ہے کہ میں بلا ضرورت کسی دکان میں داخل ہو کر بھاؤتاؤ کروں۔ ایک تو میرے پاس وقت کی ہمیشہ کمی رہتی ہے۔ دوسرے بازاروں میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔ ان مراکز تجارت میں چاہے وہ میلوں پر پھیلے ڈیپارٹمنٹل اسٹورز ہوں یا کسی پرانے شہر کے تنگ اور پر رونق بازار۔ ان سب میں مجھے یکساں گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ بیگم کے اور پیروں کے پاس خالی ہاتھ جانے میں بڑا نقصان ہے۔ بیگم کو جانے کس نے بتایا تھا کہ بجیرہ مردار کا کیچڑ بہت اچھا مڈماسک سمجھا جاتا ہے۔

بچوں کے لیے بھی کچھ لینا تھا۔ سو بادل نخواستہ خود کو بستر سے سمیٹا اور ناشتے کے بعد عبدالقادر کو اپنا مسئلہ بتایا تو آدھے گھنٹے بعد اس کا بیٹا عمار میری رفاقت کے لیے حاضر تھا۔ عمار بالکل میرے بیٹے جیسا ہے بیس برس کا۔ پر اعتماد، چال میں پھرتی، بدن ماشاء اللہ توانا اور مزاج گلستان کی ہواؤں جیسا، اس پر یہ کہ یروشلم کی ہر گلی دکان اور دکانداروں کی چال بازیوں سے واقف۔ یروشلم کے بازاروں میں مجھے اسے بھاؤتاؤ کرتے دیکھ کر لگا کہ اسے کراچی میں ایک خریداری ٹریننگ اسکول کھول دیا جائے تو تربیت کے لیے آنے والی خواتین کا ایسا رش ہو گا کہ جیسے پولیس اور کسٹمز میں بھرتی کے لیے آنے والوں کا ہوتا ہے۔ خریداری کے لیے وہ دکاندار سے مکالمہ ایسا کرتا تھا جیسے ہم ہندوستان سے کبھی کشمیر کی بات کیا کرتے تھے۔ اس کے دلائل طویل، بے رحمانہ، اور براہ راست الزام تراشی پر مبنی ہوتے تھے۔ امریکا اگر اسے اپنے تیل کی خریداری کی دلالی پر لگا دے تو عربوں کو بیس ڈالر فی بیرل سے ایک ٹکا اضافی نہ مل پائے۔ اکثر مجھے غریب دکاندار پر رحم آ جاتا جو پورا پورا دن گاہک اور سودے کے انتظار میں کے لیے بیٹھے ہیں۔

شاپنگ کے انہیں لمحات میں اس نے مجھ پر بھی اپنی چالاکی کا جال پھینکا اور اس کا آغاز اس نے ایک غیر محسوس سی ستائش سے کیا۔ اس میں ایک سی ترغیب اور انا پرستی کا مساج تھا۔ وہ آہستگی سے گویا ہوا کہ میرے والد کے مطابق مجھے مہم جوئی کا بہت جنون ہے۔

میں نے بھی اس فریب میں براہ راست کودنے کی بجائے ایک محتاط رویہ اپنایا اور جواباً وضاحت کی کہ ایسا کچھ خاص نہیں۔ اس کے باوجود اس کی ناپختہ کاری حاوی ہو گئی اور وہ کہنے لگا کہ یہودیوں کے دو اہم انبیاء کے مزارات نبی زکریا اور نبی ابراہیم کے مزارات میں لے جاسکتا ہوں۔ ”وہاں تو میں پہلے ہی ہو آیا ہوں“ میں نے بھی اپنے تمنائی کا حوصلہ کچھ پست کرنے کی ٹھانی۔ ”ارے نہیں! وہاں اندر جانے کی ایک سُرنگ ہے۔ جو ان کے زیر زمین مقابر تک لے جاتی ہے۔ ہمیں ان خفیہ راستوں کا بہت علم ہے۔ اب میرے اندر کا انڈیا ناجوز بیدار ہو گیا۔ ہم اکثر ان راستوں سے وہاں چلے جاتے ہیں تو کوئی قدیم سکہ یا اور تاریخی نوادر مل جاتا ہے جسے ہم چپ چاپ لے آتے ہیں اور منگے داموں بیچ دیتے ہیں۔





سچ بتائیں ان نوادرات کا ان اندھیرے مقابر اور زمین میں دھنس چھپ کر رہنا بہتر ہے کہ ان کے عوض ہماری جوانی کے بہتر ایام اور سب کے لیے دید و درشن کے مواقع کا بہم ہونا۔ مجھے اس کی دلیل میں جواں سال توانائی کی ایک دانائی بھری توجیہ محسوس ہوئی۔

تم ان نوادرات کا کیا کرتے ہو؟ اب میں نے سوال کیا۔

ہم انہیں بیچ دیتے ہیں۔ ”اس نے بھی مختصر سا جواب دیا۔

کسے اور کتنے پیسوں میں؟ ”یہ میرا گلا سوال تھا۔

میرے سوال پر اس کا چہرہ ایک فاتحانہ مسکراہٹ سے چمک اٹھا وہ بتانے لگا کہ اس کے کسی ساتھی کو ایک سکہ ملا تھا جسے ایک یہودی بیوپاری نے سو ڈالر کا خرید لیا تھا۔ مجھے لگا کہ سکندر اعظم کے سکے کی قیمت میں یہودی ہر حال میں فائدے میں رہے اور مسلمان اس خطرے اور محنت کے عوض فائدہ نہیں اٹھاپائے۔ یہ سکہ بالآخر برطانیہ یا امریکا میں ہزاروں ڈالر کے عوض بیچا گیا ہوگا۔ اس کی دعوت میں میرے تجسس کی سیرابی کا بہت سامان تھا مگر پھر بھی میں نے اپنے پیشے، عمر اور مراتب کے اعتبار سے اسے ناقابل عمل جانا۔ وہ مقامی

نوجوان تھے، کم عمر اور مہم جو، میرا بطور سیاح وہاں قیام ویسے بھی بہت نازک مرحلہ تھا اور ایسے میں کسی بد انتظامی اور بگاڑ کے نتائج ناخوشگوار ہو سکتے تھے۔ میں نے اسے اگلی دفعہ کا وعدہ کر کے جان چھڑائی۔ اسے میرے جواب سے مایوسی ہوئی مگر عین اس لمحے اس کے فون پر عبدالقادر کا فون آگیا۔ وہ مجھ سے گفتگو کا خواہشمند تھا۔ اس نے میرے شاپنگ کے تجربے کا احوال لینے کے بعد ایک بم گرا دیا۔ آج رات ایک بڑے ڈنر کا میں نے اہتمام کیا ہے۔ میرا سارا گھرانہ تم سے ملنے کا خواہشمند ہے اور وہ سب جمع ہوں گے سو آپ نے ضرور آنا ہے۔ میں نے اپنی بیوی سے فرمائش کی ہے اور کہا ہے کہ میرا پاکستانی بھائی آرہا ہے۔ بہترین طعام تیار کرو۔ میں نے دھمکی دی ہے کہ اس کی خاطر مدارات میں کوئی کسر رہ گئی تو اب بھی کئی خواتین مجھ سے شادی پر رضامند ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس دھمکی کے بعد ایسا عمدہ کھانا بنائے گی کہ تمہارا جی خوش ہو جائے گا۔ وہ ویسے بھی بہت عمدہ کھانے بناتی ہے۔“

اس کا یہ اعلان سن کر مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ بد بخت نے پوچھے بغیر، میرا پروگرام جانے بنا اپنی طرف سے یہ اہتمام کر لیا تھا۔ میں ڈاکٹر لانس اور اس کے طبی قبیلے کو کیا جواب دوں گا۔ برسوں کی دوستی بگڑ جائے گی۔

ہم سرجن بہت کم وقت میں بہت بڑے فیصلے کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ایک جانب میرے لیے ایک غریب آدمی کا جذبہ خیر سگالی تھا تو دوسری طرف ایک دوست کی پر تکلف دعوت۔ دوست کو سمجھانا اور گریز کرنا آسان تھا۔ اس دعوت میں جا کر میری انا کو تسکین ضرور ملتی مگر قادر کو انکار کر کے دل کو جو گھاؤ لگتا وہ بہت عرصے تک مندمل نہ ہو پاتا۔ سو میں نے بھی فوری حامی بھر لی کہ اس کے گھر آنا بالکل ایسے ہی ہوگا جیسا میں اپنے بھائی کے گھر کی پورے خاندان کی دعوت میں شریک ہوا ہوں۔



میرے لیے اب سب بڑا مرحلہ ڈاکٹر لانس کو سمجھانے کا تھا چونکہ وہ خود بھی دیانت دار انسان ہے لہذا میں نے اس کے معاملے میں سچ کی طاقت کو سب سے بہتر جانا۔ جب اسے قادر کی دعوت کا بتایا تو وہ چونکہ خود بھی بہت انسان دوست اور فطرتاً غریب پرور اور مجتہد انسان ہے لہذا خوش دلی سے مجھے معاف کر دیا۔ اس کی خوش دلی نے مجھے اور بھی ریزہ ریزہ کر دیا کیوں کہ اس نے میری معذرت کو اس عمدہ وضاحت سے تقویت بخشی کہ ہم تو میرے اگلے دورے میں جو ہانسبرگ میں پھر اکٹھے ہوں گے یہ غریب لوگ بے چارے تم سے پھر کب مل پائیں گے، تمہارا ان کے ہاں جانا زیادہ ضروری ہے۔

لیکن تم پاکستانیوں پر تو کم بختوں پر شیطان بھی بھروسا نہیں کرتا۔ کائنات میں ایسی خود غرض اور بے اصول مخلوق تو اللہ نے شاید جانوروں میں بھی پیدا نہیں کی۔ کوئی اور ہوتا تو مجھے پاکستان اور پاکستانیوں کی شان میں ایک لفظ برداشت نہ ہوتا مگر ڈاکٹر لانس یہ لائسنس صرف پرانی دوستی کی وجہ سے لے رہا تھا کیوں کہ اس کا بیانیہ جب اس جملے پر ختم ہوا کہ شاید یہ ہی برائیاں ہیں جس کی وجہ سے تم دنیا میں میرے بہترین دوست ہو تو اس کی زہر افشانی شیرینی ہزار رنگ بن کر روح میں گھل گئی۔ اس فون کے اختتام پر میری شاپنگ بھی تقریباً مکمل گئی اور میں اپنے مسجد الاقصیٰ والے گروپ سے ملنے چل پڑا۔

عصر کے وقت میں مسجد الاقصیٰ القدیم پہنچ گیا۔ عین اس مقام پر جہاں آقائے دو جہاں نبی محترم محمد مصطفیٰ ﷺ نے آج سے قریباً چودہ سو سال قبل صلوٰۃ الانبیاء کی امامت کی دور کعت دنیا کی اس تیسری مقدس ترین مسجد کے در و بام پر اک نگاہ رخصت ڈالی اور چل دیا۔ مسجد الاقصیٰ جدید کے باہر سیاحوں کا ایک انبوہ کثیر جمع تھا۔ اتوار کو یہاں اور قبۃ الصخریٰ میں غیر مسلموں کو آنے کی اجازت ہوتی ہے۔ میری خوش قسمتی کے شیخ نائف، حاتم اور نبیل انصاری تینوں ہی مجھے ڈیوٹی پر موجود مل گئے۔ وہ بڑی خندہ پیشانی سے سیاحوں کے سوالات کے جواب دے رہے تھے۔ سیاح رخصت ہوئے، عصر کی نماز ختم ہوئی تو ہم اپنے مخصوص مقام پر آن بیٹھے۔

ہمیں دیکھ کر بہت سے وہ افراد بھی آن بیٹھے جنہیں میں نے اپنے قیام کے دوران چھوٹے موٹے طبی مشورے دیے تھے۔ سب ہی میری رخصت پر دل گرفتہ تھے، گلے لگا کر عرب رسم کے مطابق گالوں کا بوسہ دیتے تھے، سب ہی مصر تھے کہ اگلے دورے میں میرا قیام ان کے آستانہ عشق پر ہوگا۔ میرے لیے انہیں بھی اللہ حافظ کہنا گراں تھا تو ان تین اعلیٰ ہستیوں کو بھی جو اس مقام عظیم کے خادمین الحرمین ہیں۔ ان کی محبت، تعلق میں لگاؤ نے میرا دل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جیت لیا تھا۔

ان کی معلومات میرے لیے فلسطین اور عربوں کے مسائل کو سمجھنے کے لیے مشعل راہ بنی تھی۔ تاریخ کا جو کیپسول انہوں نے میرے حلق سے انڈیلا تھا وہ تو ایسا تھا کہ اس کو سمجھنے کے لیے کئی کتب اور لیکچر درکار ہوتے۔ مجھے پہلے حاتم اور پھر نبیل انصاری نے گلے لگایا۔ شیخ نائف البنتہ آب دیدہ ہوئے۔ میرے دونوں ہاتھ اپنے نرم مشفق ہاتھوں میں لیے اور کہنے لگے کہ ہم تو چراغ سحری ہیں اب بجھے کہ



تب لیکن زندگی رضائے الہی سے بہت بھرپور اور مکمل گزاری ہے۔ اب ایک ہی تمنا ہے کہ مسیح علیہ السلام اور مہدی موعود دنیا میں تشریف لائیں تو ان کا اس احاطے میں خیر مقدم کر سکوں۔ یہیں پر ان کی امامت عالم کا جلوہ برپا ہوگا۔ وہ جب یہاں اپنی دو رکعت صلوٰۃ ادا کر لیں گے تو عالم فانی میں ایک جنگ عظیم Armageddon برپا ہو جائے گی۔ تم مسافر ہو، اللہ مسافر کی دعا جلد سنتا ہے تم میرے لیے یہ دعا کرنا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مجھے ایک پیکٹ عطا کیا، کہنے لگے میرے پوتے کے لیے اس میں ثوب اور میری پوتی کے لئے اس میں حجاب ہے انہیں بتانا کہ یہ ان کے فلسطینی عرب دادا کا تحفہ ہے۔

دل گرفتہ و دل بہ گریہ میں رخصت ہوا تو قبۃ الصخریٰ کا سنہری گنبد شام کے سورج کی آخری کرنوں کو بوسہ دے کر رخصت کر رہا تھا۔ مسجد اقصیٰ کی بے رنگ پتھریلی دیواروں پر میں نے ایک نگاہ ڈالی۔ وہ سارا گروپ مجھے بوجھل قدموں سے ہاتھ ہلاتے ہوئے رخصت ہوتا دیکھ رہا تھا۔ یہ میرے اپنے لوگ تھے جن سے میرا دل مل گیا تھا، جی تو چاہا کہ میں بھی پھوٹ پھوٹ کر روں مگر سیاح کا ضبط اور غرور آڑے آ گیا۔ میں بہت آہستگی سے مسلمانوں کی مکہ المکرمہ، مدینہ المنورہ کے بعد تیسری اہم عمارت سے اللہ کا شکر ادا کرتا ہوا نکل آیا کہ مجھے اس کی زیارت کا شرف باکمال حاصل ہوا۔

\*\*\*\*\*

شام سات بجے مجھے عمار اپنے گھر دعوت کے لیے لینے آگیا۔ سلوان کی بستی جہاں عبدالقادر کا گھر واقع ہے، اس کی تنگ و تاریک گلیوں سے گزرتے ہوئے مجھے لگا کہ عبدالقادر کا گھر مقبرہ اسلام سے بہت نزدیک ہے۔ ہم جس گھر میں داخل ہوئے وہ اپنے سائز میں چھوٹا اور اپنی شان میں بہت بڑا تھا۔ اس کے ہر کونے اور درتچے میں محبت کا شاندار چراغاں تھا۔ ایسی اپنائیت اور اتنی گرمجوشی جو آپ کو اپنے پیاروں کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ وسطی دالان قدرے بڑا اور بیضوی تھا یہ ان کا مین لاؤنج سمجھ لیں۔ آل ابو صبح کے بچے مہمان خصوصی کی آمد سے بے نیاز ادھر ادھر دوڑ رہے تھے، خواتین خانہ تیاری طعام اور لامتناہی گفتگو میں مصروف تھیں۔ عبدالقادر کے صاحب زدگان کو البتہ ہوش رہا مہنگائی نے مار ڈالا تھا وہ سر جوڑے اس کے سد باب کا سوچ رہے تھے۔ صاحب خانہ خود ایک کونے میں بیٹھے تمباکو پی رہے تھے۔ میری آمد پر ہر جانب سے اظہار مسرت ہوا۔ مردوں کو افریقہ آنے اور ملازمت و کاروبار میں دل چسپی تھی۔ اس کی بیٹی دعا جب میرے پاس آئی تو اس کی معصومیت اور رعنائی دیکھ کر مجھے لگا کہ میری بیوی اگر اسے دیکھ لیتی تو وہ اسے اپنی بہو بنانے کا سوچتی۔ دعا کو ڈاکٹر بننے میں دل چسپی تھی۔ ذہانت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اس کا لب و لہجہ اعتماد سے شبہ نہی اور اس کا حوصلہ ان نامساعد حالات میں بھی غیر متزلزل تھا۔ اپنے تعلیمی مستقبل سے ہراساں تھی۔ اس کے پاس نہ وسائل تھے نہ کوئی اس کے معاملے میں دل چسپی رکھتا سوائے عبدالقادر کے جسے بہت ارمان تھا کہ وہ ڈاکٹر بن جائے۔ بے چارہ اپنی مالی حالت دیکھ کر اس بچی کے خواب سن کر بطور باپ روزِ شرمندہ ہوتا تھا۔ میں نے اس سے فی الفور وچن دیا کہ زندگی رہی تو وہ ڈاکٹر ضرور بنے گی۔ اس کام میں میری مدد مکمل طور پر دامے، درمے، سخی شامل رہے گی۔ آپ اسے بے جا بڑائی نہ مانیں تو خیر سے ہماری بھتیجی دعا کا داخلہ عرب دنیا کی ایک بہترین میڈیکل یونیورسٹی میں ہو گیا ہے۔ اللہ عظیم ہے۔ مسبب الاسباب ہے۔ دو ماہ میں ایک مظلوم اقلیت کی ایک نمائندہ ذہین لڑکی اپنے کیریئر کے ایسے راستے پر گامزن ہو گئی ہے جو دوسروں کے لیے بھی مشعل راہ ثابت ہو گا۔ ایک بہت بڑے عرب ڈاکٹر صاحب میرے دوست اس کے وہاں نگران و مربی بن گئے ہیں۔ یہ سارا گھرانہ بے حد خوش ہے۔

تل ابیب کے محملی اور شاہانہ ڈیوڈ انٹرکانہینمنٹل کے ڈائمنگ ہال میں اسرائیل کے بہترین یہودی ڈاکٹروں کی دعوت طعام سے ہٹ کر یہاں مظلومین کی بستی سلوان میں اپنے ہم مذہب مسکین طبع عرب خانوادے میں گھر کی پکی ہوئی مستند عرب ڈشوں کا ذائقہ ان کے خلوص نے دوبالا کر دیا تھا۔ فلسطینی مقلوبہ کباب اور ان کا پکوان منصف ایسے لذیذ تھے کہ مجھے یقین آگیا کہ عبدالقادر کی بیوی جیسی دنیا میں کوئی عورت فلسطینی کھانا بنا ہی نہیں سکتی۔

کھانے کے بعد جب میں اور قادر بالکونی میں بیٹھے تھے تو میں نے اس سے ایک ہفتے کی ٹیکسی اور سفری رہنمائی کے معاوضے کا پوچھا تو وہ تاؤ کھا گیا کہ میں نے اس کی بے عزتی کی ہے۔ وہ کہنے لگا کہ زندگی بھر میں نے کئی مسافر اپنی ٹیکسی میں بٹھائے۔ ایسا کوئی نہ تھا جسے میں اپنے گھر میں ایسے لایا ہوں جیسے میرے بھائی آتے ہیں۔ تم بھاڑے کی سواری نہ تھے تم تو میرے بھائی ہو۔ تم یہ نہ سمجھو کہ میں نے تمہارے

بارے میں گوگل نہ کیا تھا، مجھے تمہاری کافی مصروفیات اور اسٹیٹس کا علم تھا مگر عجب بات تھی کہ تم نے وہی کھایا جو میں نے کھلایا۔ کئی دفعہ میری کار کو دھکا بھی لگایا، کئی مرتبہ تم پیسوں سے بھرا بٹومیری کار ہی میں چھوڑ گئے۔ میں نے تم سے ایک پھوٹی کوڑی بھی چارج نہیں کرنی۔ میں نے کہا یہ میرے لیے بہت ظلم کا مقام ہو گا کہ میں دس دن تک تمہارے وقت اور کار بمعدہ پیٹرول اور تمہاری خوشدلانہ خدمات اور موجودگی کا کوئی معاوضہ نہ دوں۔ محض اس لیے کہ تم مجھے بھائی کا درجہ دیتے ہو۔

وہ کہنے لگا کہ دکھ یہ ہے کہ ہماری رفاقت کے یہ دن بہت تھوڑے تھے۔ یہی کل دس دن۔ آؤ چائے پیتے ہیں۔ چائے ختم ہوئی تو میں نے اس کے پورے گھرانے کے نوجوانوں بچے بچوں کو بطور مالدار چچا اپنے ارد گرد جمع کیا اور اپنی جیب خالی کر دی، یہ رقم اس سے کہیں زیادہ تھی جو قادر مجھ سے دس دن کے جائز طور پر مانگ سکتا تھا۔

وہ اور اس کے اہل خانہ احتجاج کرتے رہے مگر میں نے کہا یہ چچا اور ان بچوں کا معاملہ ہے مگر میں نے صرف اتنی درخواست کی کہ کل وہ ایئر پورٹ کا کرایہ نہیں مانگے گا کیونکہ میرے پاس نقد رقم اب بالکل ختم ہو گئی ہے۔ اگلی صبح وہ چار بجے مجھے لینے آگیا۔ ہوٹل کے منیجر رفیق صاحب موجود نہ تھے میں نے شکریہ کا ایک نوٹ ایک عدد تحفے کے ساتھ چھوڑ دیا۔ بل میں سرشام ہی ادا کر چکا تھا۔

یروشلم سے تل ابیب کے بن گوریاں ایئر پورٹ تک کاراستا ہم نے نسبتاً خاموشی کاٹا۔ وہ جب میرا سامان کار کے بوٹ سے نکال رہا تھا تو میں نے بہت آہستگی سے اسے کہا کہ شکریہ ادا کر کے میں اس کی رفاقت کی توہین نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے ایک دنیا دیکھی ہے، نصف سے زیادہ۔ ہر رنگ اور نسل کے لوگوں سے ملا ہوں پر تم بہت انوکھے ہو۔ میں تمہیں بھول نہیں پاؤں گا۔ اس نے بھی مجھے خبردار کیا کہ ایسا ہرگز نہ کرنا، اگلی دفعہ اپنے بیوی اور بچوں سمیت آؤ۔ ان سے کہنا تمہارا جیٹھ اور تمہارا تایا وہاں منتظر ہے۔

عبدالقادر سے گلے لگ کر بو جھل قدموں سے رخصت ہوا تو میرے Carry-on Baggage میں زندگی کے کئی سبق، دوستی کے نئے معیار میرے ساتھ تھے۔ کہنے کو وہ عرب، نیم خواندہ تھا مگر محبت اور تعلق کو علم کا مساوی سمجھا جائے تو وہ ان مضامین دلداری میں یقیناً ڈبل پی۔ ایچ۔ ڈی تھا۔

اسرائیل کو چھوڑنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کسی مہم جو فوجی حاکم کے لیے کابل کو، مغل بادشاہ بابر نے جب انیس ماہ کی حکمرانی اور قبضے کے بعد دشمنوں سے جان بچا کر راہ فرار اختیار کی تو ہندوستان کا رخ کرنے سے پہلے اس نے کابل کے لیے کہا تھا کہ ”اس شہر میں بطور حاکم داخل ہونا آسان اور زندہ بچ نکلنا محال ہے۔ وہی اسرائیل پر صادق آتا ہے۔ ایک سے زائد مقام پر آپ کی مغربی کنارے کے دورے سے ملاقاتیوں کے کوائف کے بارے میں تصدیق کی جاتی ہے۔ کئی مقامات پر آپ کو بلاوجہ روک کر بیگ کی دوبارہ تلاشی لی جاتی ہے۔



بمشکل فراغت ہوئی، ڈیپارچر لاؤنج میں کافی کی پیالی ہاتھ آئی تو میں سوچنے لگا کہ میرے تجربات کے اس سفر میں کتنے پر تو Layers ہیں۔ کچھ قابل بیان، کچھ نجی محسوسات۔ مثلاً میری جورات مسجد الاقصیٰ قدیم میں گزری وہ نجی وارداتوں کا ایک طوفان بلاخیز ہے، عشق کی ایک گھات ہے۔ داغ دہلوی نے کہا تھا

دل میں رکھنے کی بات ہے غم عشق

اس کو ہر گز نہ برملا کہیے

جو کچھ میں نے ان تینتیس اقساط میں بیان کیا۔ وہ یقیناً وہی کچھ ہے جو میں نے دیکھا اور سمجھا۔ اسرائیل کا سفر محض ایک ویزہ اور عبدالقادر کی سفری رہنمائی نہیں۔ یہ تو پیاز کی طرح پرت در پرت مسافت ہے پھیلنے چلے جاؤ۔ مجھے یقین ہے میں نے فلسطینیوں کی زبوں حالی اور مظلومیت کو بلا کم و کاست سچائی سے بیان کیا ہے۔ قدرے Clinically۔ اپنے مذہبی لگاؤ اور وابستگی کو وہاں شدت سے محسوس تو ضرور کیا مگر اسے اپنے بیان سے دور رکھا۔

مجھے اس بات کا بھی شدت سے احساس ہے کہ ان فلسطینی عرب مسلمانوں کی جرات اور ان پر ہونے والے مظالم دونوں ہی کے بارے میں میرے اظہار ہمدردی اور ادراک میں ایک جڑواں کمزوری ہے۔

ایک اور پہلو کا بھی یہاں بیان لازم ہے اور یہ پہلو قدرے کم توجہی کا شکار رہا ہے۔ اس کے اظہار میں میرے کئی ایسے یہودی دوست جن کی انسان دوستی، دیانت داری اور قابلیت کی میں تہہ دل سے عزت کرتا ہوں وہ اس سے کچھ کبیدہ خاطر ہوں گے۔ عالم اسلام میں بسنے والے خصوصاً ہر یہودی کو لالچی، بے ایمان، بے رحم اور اپنا اور اسلام کا دشمن سمجھتے ہیں۔

ایسا ہر گز نہیں، میں نے دنیا بھر میں ان کے ساتھ کام بھی کیا ہے اور ان سے دوستیاں بھی پالی ہیں۔ یہ بڑے لاجواب لوگ ہیں۔ ان میں ڈاکٹر لانس اور ڈاکٹر کلور جیسے ہمدرد، وفادار، دیانت دار اور غریب پرور انسان تو مسلمانوں میں نایاب ہوں گے۔ اسرائیل کے اس سفر میں میری آنکھیں ایک تلخ انکشاف نے کھول دیں۔ اسرائیل میں اپنی آنکھوں سے میں نے جو کچھ دیکھا۔

اس حقیقت کو اگر میں بیان نہ کروں تو یہ میرے لیے ایک جھوٹ ور روحانی اور عالمانہ غداری ہوگی۔



مراکش کے یہودی علما

آپ تو جانتے ہی ہیں کہ جنگ عظیم اول سے ہی ایک تسلسل سے دنیا کو یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ یہودی ایک مذہب اور ایک قوم ہے۔ اسرائیل ان کی ارض موعود یعنی Promised Land ہے۔ اس سر زمین قدیم جہاں وہ خود بھی جان بچا کر بطور پناہ گیر مصر سے پہنچے تھے۔ اس سر زمین وعدہ میں رہنے کا حق تھا صرف ان ہی کو ہے۔ یہ محض ایک صیہونی پروپیگنڈہ ہے۔ یہودی بھی نسلاً ایک دوسرے سے اتنے ہی مختلف ہیں جتنے مختلف اقسام کی بلیاں اور طوطے۔ عرب روسی اور یہودی، ایتھوپیا کا سیاہ فام یہودی اور ایران کا یہودی، یورپ کا یہودی اور ہندوستانی یہودی یہ ایک دوسرے کو اسرائیل میں اپنی زبان نسل، کلچر اور دیگر تخصیص کی بنیاد پر ایک دوسرے کو خوش دلی سے برداشت نہیں کرتے۔

اسرائیل کی موجودہ صورت حال کو اگر تاریخ کے تناظر میں دیکھیں تو یہودی واضح طور پر دو بڑے گروہوں میں منقسم ہیں۔ ان کو Sephardic یعنی ہسپانوی اور عرب یہودی جن میں Mizrahi بھی شامل ہیں، جنہیں خود عرب سفاردیون اور المشرقیون کہتے ہیں اور Ashkenazic یعنی جرمنی، روس اور اس سے ملحقہ علاقوں کے یہودی۔ ان کی بڑی اکثریت امریکا، اسرائیل، جرمنی، برطانیہ اور کینیڈا میں رہتی ہے اور کل تعداد سوا کروڑ کے لگ بھگ ہے۔

عرب یہودی حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے شام کی اولاد ہیں۔ مذہبی تفاوت سے قطع نظر عرب عیسائی، عرب یہودی اور عرب مسلمان دور کہیں جا کر آپس میں خونی رشتوں سے جڑے ہیں۔ یوں یہ سب ایک ہی نسل، علاقے اور زبان کے مضبوط بندھنوں سے پیوستہ لوگ ہیں۔ یہ پر امن طور پر رہنے کے عادی ہیں۔ ایک دوسرے سے زبان اور ثقافت کے حساب سے ایسے جڑے ہیں کہ عرب

مسلمان، عرب یہودی اور عرب عیسائی کا ایک گروپ اگر کہیں موجود ہو تو وہ ایک پنجابی مسلمان، کیرالہ کے یہودی اور نیپالی عیسائی کے دوسرے گروپ کی نسبت آپس میں ایک دوسرے سے زیادہ یگانگت اور لگاؤ محسوس کرے گا اور پہلا گروپ پہلے گروپ والوں میں ہی زیادہ گھل مل جائے گا یقیناً مانے عرب مسلمان، عرب یہودی اور عرب عیسائی ایک بنگالی، پختون اور کاشغر کے مسلمان کی نسبت زیادہ شیر و شکر ہوں گے۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ آپ مان لیں تو اچھا ہے۔

جنگ عظیم اول کے بعد Sykes-Picot معاہدے کے تحت قومی ریاستوں نیشن اسٹیٹ کے قیام سے قبل بہت امن و سکون اور بھائی چارے سے رہتے تھے۔ ان میں قتل و غارت گری کی کوئی بڑی تاریخ نہیں۔ اسلام اپنے دور وسعت میں بھی عرب یہودیوں کے لیے کبھی بہت بار گراں نہیں رہا۔ جتنے روہنگیا مسلمان برما میں بدھ بھکشوؤں نے مارے ہیں ان کی نسبت آدھے مسلمان بھی رسول اکرم ﷺ کے زمانے سے آج تک یہودیوں کے ہاتھوں ہلاک نہیں ہوئے۔

Ashkenazi یہودیوں کا معاملہ مختلف ہے۔ یہ وسطی ایشیا کے جنگجو، لادینی قبیلوں Khazars کی اولاد ہیں۔ یہ ایک ایسے معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں جو بہت شدید اخلاقی انحطاط کا شکار تھا۔ سن 750 عیسوی میں ان کے بادشاہ بولان نے اپنی قوم کا اخلاقی قبلہ درست کرنے کے لیے ایک بڑے دین کو اپنانے کا سوچا۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنی مملکت میں موجود یہودی، عیسائی اور مسلم مذہبی رہنماؤں کو مکالمے کے لیے طلب کیا۔ اس نے بہت تحمل سے تینوں کے دین کے محاسن کو سنا اور یہودی مذہب کو اپنا سرکاری مذہب چن لیا۔

اس فیصلے میں سیاسی مصلحت زیادہ اور مذہبی ذوق فکر کم تھا۔ اس کی بادشاہت کو ایک جانب سے مسلمان مملکتوں نے تو دوسری جانب سے عیسائیوں نے گھیرا تھا۔ کسی ایک کو اپنانے کا مطلب دوسرے کو مستقل بنیاد پر ناراض کرنا تھا۔ منگولوں نے چنگیز خان کے دور میں انہیں مار بھگایا تو یہ مغرب کی سمت پولینڈ اور ملحقہ روسی علاقوں میں ہجرت کی تلخیوں، دطن کی محرومی اور اپنی طاقت میں بے پناہ اضافے کے جذبات اپنے دلوں میں چھپائے پناہ گزین ہو گئے۔

ان یہودیوں کو وہاں مقامی زبان میں Ashkenazi کہا جانے لگا یعنی قازار پناہ گیر۔ تب تک صلاح الدین ایوبی کے طبیب یرون بن ماؤن نے تلمود ترتیب دے دی تھی۔ یہ ان قبائل کے لیے توریت کی نسبت زیادہ قابل عمل کتاب تھی۔ اس میں 63 ابواب ہیں جو سماجی قوانین پر مشتمل ہیں جنہیں یہودی رہائشیوں کے ایک چھوٹے سے گروپ نے اپنی سمجھ سے لکھا تھا۔ اس میں غیر یہودیوں یعنی Gentiles کے لیے بہت نازیبا کلمات درج ہیں، کئی مقامات پر تو انہیں جانوروں کا ہم پلہ شمار کر کے ان کی عورتیں مال منال مملکت سبھی پر جائز ناجائز طریقے سے قبضہ یہودیوں کے لیے Kosher یعنی حلال اور پسندیدہ فعل قرار دیا گیا ہے۔





اشکینازی یہودیوں کے سربراہ ڈیوڈ لاؤ

اسرائیل میں موجود حکمران طبقہ اور یورپ امریکا کے بیشتر بااثر اور مالدار صیہونی یہودی انہیں Ashkenazi یہودیوں کی اولاد ہیں۔ دنیا بھر میں جو بڑے یہودی نام ہیں ان کی اکثریت جیسے ڈارون، آئن اسٹائن، برنی سینڈر، ٹرائسکی، کارل مارکس، ٹرائسکی، میڈلن البرائٹ، روتھ شیلڈز، سوروز، موشرے دایان، بن یامین نیستن یا ہو، اداکارہ اسکار لیٹ جو ہناسن ان ہی اشکانزی یہودیوں کی نسل ہیں۔ ان کے طرز فکر اور ان کے رویے پر تلمود کی انہیں انتہا پسندانہ تعلیمات کا اثر بہت شدت سے غالب ہے۔

اسرائیل کے یہ یورپی یہودی Mizrahi اور Sephardic یہودیوں کو وہی درجہ دیتے ہیں جو ہندوستان میں دلت ہندو جاتی کو دیا جاتا ہے۔ انہیں جاہل، کم عقل اور حقیر سمجھا جاتا ہے۔ بہترین ملازمتوں کے دروازے ان پر مسدود ہیں۔ تل ابیب، جافا میں رہنے والے کئی ایسے خاندان یہودیوں کی اسی عربی النسل شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ مظلوم یہودی خط غربت سے نیچے بہت غیر انسانی معیار کی زندگی گزارتے ہیں، میں نے ان کی بستیوں میں کئی ایسے افراد دیکھے جو یہودی تھے اور فلسطینی عرب مسلمانوں کی سی مظلوم، بے آسرا اور غربت کی ماری زندگی گزار رہے تھے۔ صرف یہودی ہونے کی وجہ سے ان پر وہ بے رحم قوانین کا سنگ دلانہ اطلاق نہیں ہوتا جن کا وہاں کے عرب مسلمانوں کو آئے دن سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اپنے قیام کے دوران مجھے ان Sephardic یہودیوں کا ایک ایسا بھی گھر دیکھنے کا اتفاق ہوا جہاں دو کمرے کے گھر میں اٹھارہ افراد رہائش پزیر تھے۔

تل ایب اور ان کی بستیوں میں آپ کو کم سن، بمشکل بالغ لڑکیاں بطور طوائف عام دعوت گناہ دیتی دکھائی دیں گی۔ ان مظلومین کا موازنہ آپ غریب سے غریب مسلمان عرب بستی سے کریں تو کیا مجال آپ کو کوئی بوڑھی عورت بھی بے حجاب اور بلا ضرورت گھر سے باہر دکھائی دے۔ میں نے معصومیت، پاکیزگی، بلند کرداری، صبر جمیل کے جو عظیم اور قابل تقلید اوصاف ان خواتین کے معمولات زندگی میں دیکھے وہ قابل تحسین ودعا ہیں۔ غیرت، کردار اور عورتوں کے معاملے میں فلسطین کے عرب مسلمانوں کا طرز فکر خالصتاً اسلامی افکار پر استوار ہے اور قدرے قدامت اور شدت پسند سلفی سوچ والا۔ اللہ ان کی استقامت کی جزا ان کو یہاں اور بعد از ماں بھی دے۔



سفاری یہودیوں کے رہنما ربائی یوسف استاخیز

ایک اور بے حد دل چسپ راز

فدائی حملوں میں فلسطینی عرب اس بات کا خاص اہتمام کرتے ہیں کہ عربی النسل Sephardic یہودیوں کو نشانہ بنائیں۔ کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ انہوں نے انہیں چھوڑ دیا اور یورپی نسل کے Ashkenazi یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اب آپ کو علم ہو گیا ہو گا کہ ایرانیوں کی طرح عربوں میں بھی رشتہ داریوں کا جال بہت دور تک اور بری طرح سے پھیلا ہے۔ یہ سب کے سب نسل پرست ہیں۔ Sephardic یہودیوں کی اکثریت اب یورپ کا رخ کر رہی ہے۔ صرف وہی یہاں رکے ہوئے ہیں جن کے پاس سفر کا وسیلہ نہیں۔ آپ کو اس نسلی امتیاز، اس معاشرتی تفاوت کا ادراک دلانا ضروری تھا۔ قومیں جب نسل و زبان کو اپنا بنیادی بونڈ بناتی ہیں تو اس میں بہت سی فرقہ بندیاں ہو جاتی ہیں۔

مجھ پر یہ فرض بنتا ہے کہ میں آپ کو اس حقیقت سے آگاہ کروں کہ اسرائیل میں یہ نسلی امتیاز جس بُرے طریقے سے یہودیوں نے درآمد کیا ہے۔ یہ نسلی امتیاز ان کی قومی زندگی کے رگ و پے میں ایک خفیہ زہر بن کر سرایت کر چکا ہے۔ اس کے بارے میں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت لاعلم ہے۔ جس طرح امریکی مغربی استعمار عیسائی نیو کونز اور صیہونیت نے روس کی افغانستان میں آمد اور ایرانی انقلاب کی درپردہ شدید معاونت کر کے ہمارے ہاں اب فرقہ واریت کو ہوادے کر دنیائے اسلام کو سنی۔ شیعہ کیمپ میں تقسیم کر دیا اور مشرق وسطیٰ میں ایک آتش نمرود بھڑکا دی ہے۔ اسی طرح ہمیں بھی اپنے بیانیے کے خطوط نئے طور پر استوار کرنے پڑیں گے تاکہ جب نئے حرب عظیم یعنی Armageddon کا وقت آئے تو ہمارے لیے دوستوں اور دشمنوں کی تقسیم سہل ہو جائے۔

اسرائیل کی ایئر لائن El-AL نے جو ہانسبرگ کے لیے اڑان بھری تو مجھے کئی جانے پہچانے چہرے نظر آئے، ایتھوپیا کے سیاہ فام درجہ سوئم یہودی، خوش حال جنوبی افریقی گورے درجہ اول کے یہودی۔ عیسائی پادری اور نن بی بیاں، میری نشست بد قسمتی سے کسی برق تپاں خاتون کے بجائے زندگی کے دن تسبیح پر شمار کرتی ایک بوڑھی یہودن اگا تھا کے پہلو میں تھی۔ میری نشست پر آمد سے وہ ایسے ہی خوش ہوئی جیسے میں اداکارہ جینفر لارنس ماڈل گنگی حدید یا دیپیکا پڈکون کے آنے پر ہوتا۔

اپنی دانتوں سے عاری بے پایاں مسرت کا اظہار اس نے اتا ولے پن سے ایک جخربسکٹ مجھے تھما کر کیا۔ میرے دوست اقبال دیوان ساتھ ہوتے تو کہتے ”ہائے بچاری ہماری زندگی۔ ڈاکٹر کیش بابو کس دورا ہے پر آگئی ہے۔ یہ پہلی خاتون ہے جو اپنی ہی سیٹ پر ہمارا انتظار کر کے بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو گئی ہے“ مادام اگا تھا کی ملازمہ ان سے پرے اکانومی کلاس میں موجود تھی۔ خود سال بھر کی اسرائیل یا ترا سے لوٹ رہی تھیں۔ جہاز نے ٹیکسی کرنا شروع کیا تو میں نے کھڑکی سے اس بنجر و بے لطف زمین پر نگاہ ڈالی جسے انبیاء نے اپنا مسکن بنایا۔ مجھے ایسا لگا کہ ایئر پورٹ کی بتیوں کی جگہ عبدالقادر، نبیل انصاری، راجہ مریمز، نبیل انصاری اور شیخ نائف مجھے ہاتھ ہلا کر رخصت کر رہے ہیں۔ میرے ذہن میں عالی مرتبت شیخ نائف کے الفاظ گونج رہے تھے۔

انہوں نے کہا تھا ”ابتدائے آفرینش سے ہی اہل سلوک و مشتاقان دید و دلداری یہاں تلاش حق میں آئے۔ ہمیشہ سے لٹنی اس سرزمین نے آستانہ اور دامن درویش کی طرح کسی کو کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹایا۔ جان لو کہ اس سرزمین نے تمہیں بھی اپنا لیا ہے۔ یہ اب تمہارے وجود کا حصہ بن گئی ہے۔ یہاں سے کبھی کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹا، تم غور کرو گے تو تمہاری زندگی بھی یہاں سے لوٹ جانے کے بعد نئی وابستگیوں سے آشنا ہو جائے گی۔“



میں انہیں خیالات میں غلطاں تھا کہ اسپیکر پر اعلان ہوا کہ اسرائیل کی مقدس سرزمین کو ہم اب خیر باد کہنے والے ہیں۔ جو منظر یہاں آمد کے وقت تھا اس میں رجائیت تھی تو اب دم رخصت معاملہ اس کا بالکل الٹ شام غریباں والا تھا۔ ایک طرف تو جھک جھک کر کورنش بجاتے ہوئے ربائی سوگوار تھے تو تقدیس جدائی سے نڈھال فریبہ اندام یہودی پیپیاں بھی با آواز بلند ہچکیاں لے لے کر اشک بار تھیں۔ انہیں مسافران دل گزیدہ میں جو ہانسبرگ کے ایک سنگ دل ہارٹ سرجن کے دو آنسو بھی اشک رواں کی اس لہر میں چپکے سے شامل ہو گئے تھے۔

## اختتامیہ

میں اپنے عزیز دوست اقبال دیوان کا مشکور و ممنون ہوں جن کی بے حد حوصلہ افزائی اور تحریک پر مجھے جرات اظہار ملی۔ وجود کے ایڈیٹر محمد طاہر کا بھی شکریہ جن کی فراخ دلی نے میری ان نگارشات کو بہ کمال حسن اور مناسب انداز میں پیش کیا۔

دیوان صاحب نے اسے بے حد دل چسپ پیرائے میں قالب اردو میں ڈھالا۔ میرے جملے اور بیانیہ ایک طبیب بے نوا کا نسخہ ہوتے تھے۔ سرجیکل آلات جیسے بے رحم اور مطلب پرست، پتلے حفاظتی دستانوں جیسے بے لذت۔ دیوان صاحب انہیں ایسا پرکار بناتے اور بر محل تصاویر سے یوں مزین کر دیتے کہ قاری رفیق سفر بن جاتا تھا۔ ان کی ہمت افزائی نہ ہوتی تو مجھے ادیب بننے کا یہ چسکا بھی نہ پڑتا۔ یہ جرات تحریر نہ آتی۔ یوں یہ سفر نامہ ایک تحریک نہ بنتا جس کی وجہ سے وہاں مقیم بہت سے نوجوان مظلومین کی زندگی نہ بدل پاتی۔ آپ نے عبدالقادر کی صاحبزادی دعا کا احوال تو پڑھ ہی لیا کہ کس طرح اس کی رکی ہوئی تعلیم کا سلسلہ یوں جڑا کہ وہ اپنے گھرانے اور قبیلے کی ڈیڑھ سو لڑکوں میں پہلی بچی ہے جو کچھ بین الاقوامی مسلمان مہربان ڈاکٹروں کے طفیل عرب دنیا کے بہترین میڈیکل کالج میں پہنچ گئی ہے۔ سوچئے اس سفر نامے نے چند درد مند با اثر کو آپس میں کیسے جوڑ دیا ہے کہ یہ تحریک کسی ضابطے، قانون کو توڑے بغیر چند مظلوم ترین افراد کی زندگی میں ایک عظیم تبدیلی کا باعث بن گئی اور اللہ کی مدد شامل حال رہی تو اس چراغ سے مزید چراغ جلیں گے۔

میرے قارئین کا بھی بے حد شکریہ، جنہوں نے ہر قدم، ہر فقرے، ہر مقام پر اپنی دل چسپی کا برقی پیغامات اور فیس بک کے ذریعے اظہار کیا۔ یہ میرے لیے بہت حوصلہ افزائی کا باعث بنا۔ اللہ آپ کو اپنی حفظ و امان میں رکھے اور آپ کی اور فلسطینی عرب مسلمانوں کی مشکلات آسان کرے۔ میرے وہ قارئین جنہیں وقت اور یادداشت اتنی مہلت نہیں دیتے وہ تین ماہ اور صبر کریں تاکہ یہ سفر نامہ کتاب کی صورت میں انہیں مل جائے۔

ختم شد۔